فرخندہ رضوی

شاعری اور شخصیت

نازیہ کوثر

فرخندہ رضوی

(شاعری اور شخصیت)

نازیہ کوثر

حسنِ ادب ،فیصل آباد
0321-7044014

ASIAN RESEARCH INDEX OPEN ACCESS BY ECO FRIENDLY

Farkhanda Rizvi

(Shairi aur Shakhsiat)

By

Nazia Kausar

ARI ID: 1688708425998

''جملہ حقوق بحقِ مصنفہ محفوظ ہیں''

کتاب: فرخندہ رضوی

(شاعری اور شخصیت)

مصنفہ: نازیہ کوثر

حروف بندی: محمد مظہر قیوم

نظرِ ثانی: ڈاکٹر مشتاق عادل

سرورق: ڈاکٹر عارف حسین عارفؔ

ناشر: حسنِ ادب فیصل آباد

اشاعت: 2023ء

قیمت: 500روپے

Licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

یہ کتاب مہکاں پنجابی ادبی بورڈ اور محکمہ اطلاعات وثقافت
کے تعاون سے شائع ہوئی

والدین کے نام

فہرست

❖ پیش لفظ ۵

❖ فرخندہ رضوی۔۔۔ایک تعارف ۷

❖ فرخندہ رضوی کی تخلیقات ۲۵

❖ سماج اور سماج فہمی ۳۵

❖ فرخندہ رضوی کی شاعری میں سماجی پہلو ۸۳

سنو خموشی کی داستان ۸۵

فاصلے ستا رہے ہیں ۸۸

❖ فرخندہ رضوی کی شاعری میں سماجی پہلو ۱۲۷

زیرِ لب خنداں ۱۲۷

خوشبوئے خندہ ۱۲۷

❖ فرخندہ رضوی کا اختصاص ۱۷۵

❖ کتابیات ۱۹۱

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

پیش لفظ

عزت مآب اللہ تبارک وتعالیٰ کا لاکھ مرتبہ شکر اور محبوب خدا حضرت محمد ﷺ پر کروڑوں درود و سلام۔ میرے شوہر (نواز بیگ) کی محبتوں، مہربانیوں اور تعاون کا فیض ہے کہ میرا مقالہ پایہ تکمیل تک پہنچا۔ (الحمداللہ)۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ میرے شوہر کا سایہ مجھ پر اور میرے بچوں پر ہمیشہ قائم رہے (امین)۔

استادِ محترم ڈاکٹر فرتاش سید (مرحوم) کی سپاس گزار ہوں جنھوں نے برطانوی لیڈی فرخندہ رضوی (جو پاکستان کی دختر ہونے کا اعزاز رکھتی ہیں) سے میرا ٹیلی فونک رابطہ کرایا۔ وقت نے انھیں مہلت نہ دی کہ وہ بطور نگران مقالہ اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ انھیں کروٹ کروٹ جنت الفردوس نصیب فرمائے۔

بعد ازاں میں اپنے نگران مقالہ ڈاکٹر مشتاق عادل کی دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکر گزار ہوں جنھوں نے مقالہ کے تمام مراحل میں محبت اور شفقت سے ہر ممکن مدد و رہنمائی کی اور تعاون فراہم کیا۔ بلاشبہ ان کا شفقت بھرا لب ولہجہ مدبرانہ گفتگو اور حوصلہ افزائی چند ایسے عناصر ہیں جو مجھ ناچیز کے مقالہ کو تکمیل کے مراحل تک پہنچانے میں مدد و معاون ثابت ہوئے۔ میں اپنی معاون نگران میڈم ماریہ بلال، ڈاکٹر عامر اقبال، ڈاکٹر یوسف اعوان، ڈاکٹر یاسمین اور شعبہ اردو کے دیگر اساتذہ کرام کی بھی ممنون ہوں کہ جنھوں نے کمالِ محبت و شفقت سے تدریسی عمل کے دوران مخلصانہ رہنمائی کے ذریعے بھرپور معاونت کی۔

میں محترمہ فرخندہ رضوی کے حسنِ تعاون کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے ہر بار میرے ٹیلی پر رابطہ کرنے پر فوری جواب دیا اور قدم قدم پر میری رہنمائی فرمائی اور مواد کی فراہمی میں فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ عائشہ راٹھور جنھوں نے مجھ سے پہلے فرخندہ رضوی پر تحقیقی مقالہ لکھا، کی بہت شکر گزار ہوں کہ انھوں نے کتب کی فراہمی اور رہنمائی سے نوازا اور بھرپور تعاون فرمایا۔

اپنے سکول کی ہیڈ ٹیچر صائمہ مختار کے ساتھ ساتھ عظمیٰ ریاض، سلمیٰ رزاق اور بشریٰ پروین کی

محبتوں اور تعاون کو بھلایا نہ جا سکے گا۔ان سب کے لیے ڈھیروں دعائیں ۔اللہ پاک انھیں ہمیشہ خوش وخرم اور آباد رکھے۔

میں اپنے تمام ہم جماعتوں کی بالخصوص اور ثوبیہ رحمت، صفیہ بوٹا اور نگینہ نذیر کی محبتوں کی مقروض ہوں۔اللہ پاک سب پر اپنی رحمتوں کے دروازے کھلے رکھے۔

میں خصوصی طور پر اپنی زندگی کے ہم سفر کی محبتوں کی مقروض ہوں کیوں کہ میرا تعلق پٹھان فیملی سے ہے اور اپنے خاندان کی پڑھی لکھی عورت ہونے کا اعزاز بھی میرے شوہر کی نظرِ کرم کا اعجاز ہے۔وگرنہ ہمارے خاندان میں لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کا کوئی رجحان نہیں ہے۔لیکن میرے شوہر نے میرے اس شوق کو تکمیل تک پہنچانے میں میری بھرپور مدد کی۔اللہ پاک تا حیات میرے ہم سفر کا سایہ سر پر سلامت رکھے (آمین)۔

میں اپنی پیاری بہنوں عمرانہ اور فائزہ خان کی محبتوں کی بھی مقروض ہوں جنھوں نے میرے لیے قدم قدم پر مہربانیاں اور آسانیاں پیدا کیں۔ دعا ہے کہ اللہ پاک ان پر اپنا خصوصی کرم فرمائے۔

مقالہ لکھنے کے بعد مقالہ کمپوز کروانا بھی ایک مسئلہ ہوتا ہے۔اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے والے مظہر قیوم کا شکریہ ادا نہ کروں تو زیادتی ہوگی۔آخر میں اپنی فیملی کی شکر گزار ہوں جن کی محبت قدم قدم پر میرے شاملِ حال رہی۔میری فیملی میری جنت ہے۔بارِ دیگر تمام احباب کا شکریہ۔

اب یہ مقالہ کتابی صورت میں شائع کرنے جا رہی ہوں۔آج کل کے دور میں کتاب سے محبت کم ہوتی جا رہی ہے مگر پھر بھی چند میرے جیسے سر پھرے اس دنیا میں موجود ہیں جو کتاب سے رشتہ اور تعلق نبھاتے چلے آ رہے ہیں۔میں امید کرتی ہوں کہ میری یہ کاوش اُن قارئین ادب کو پسند آئے گی (ان شاءاللہ)۔

نازیہ کوثر

فرخندہ رضوی۔۔۔ایک تعارف

شاعری خوشبو ہے۔شاعری مہک ہے۔شاعری دل ناز کا ترانہ ہے۔شاعری جذبات و احساسات اور تخیل کو لفظی پہناوا پہنا کر پیش کرنے کا نام ہے۔شاعری ایسے طلسم کدے کا نام ہے جو زمان ومکان کی قیود سے آزاد ہوتی ہے۔شاعری محبت کا دوسرا نام ہے شاعری جذبات کے ریلے میں بہہ جانے کا نام ہے یہ سفر رواں دواں ہے اور ہمیشہ جاری وساری رہے گا۔

شاعری کے کئی روپ ہیں کبھی یہ غزل اور کبھی نظم کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔کہیں رباعی اور کہیں قصیدہ کے پہناوے میں سامنے آتی ہے۔کبھی شعلہ بن کر اور کبھی شبنم میں ڈھل کر جلوہ نما ہوتی ہے۔کہیں عشق ومحبت کے راگ الاپتی نظر آتی ہے تو کبھی آنسوؤں کی بے بس مورت کا روپ دھار لیتی ہے۔کہیں یہ سہمی ہوئی گھٹی چیخ تو کبھی انالحق کا نعرہ بن جاتی ہے تو کبھی باضابطہ مقصدِ زندگی کا اظہار بن جاتی ہے۔

موثر اور میعاری شاعری معاشرے پر گہرے مثبت اثرات مرتب کرتی ہے ہے کسی بھی شاعر کی زندگی اس کی شاعری پر کسی نہ کسی حوالے سے ضرور اثر انداز ہوتی ہے۔شاعر اپنی زندگی کے حالات وواقعات اور اردگرد کے ماحول سے جو کچھ حاصل کرتا ہے۔وہی سوچیں شاعری کی بنیاد بن کر سامنے آتی ہیں۔شاعر کے خیالات اور سوچ و بچار پر سماج،گھریلو حالات،اپنوں کے رویے، خوشی اور غم،عشق ومحبت،حاصل زیست اور محرومی کے اثرات کا واضح اثر ہوتا ہے۔

جہاں تک غزل اور نظم کے معیار کی بات ہے تو اس میں اسلوب اور تخیل بہت اہمیت کے حامل ہیں۔اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ شعری تخلیق کے لئے خیال ہی بنیاد ہے۔اس حوالے سے شعر لکھنے کے لیے نہیں بلکہ شعر کہنے کے لئے خیالات کی فروانی اہم ترین عنصر ہے۔جس کے بعد طبیعت کی موزونیت،علم کی ضرورت مطالعہ اور مسلسل مشق شاعر کو شعر کہنے کے قابل بناتے ہیں۔

شاعری انسانی سوچ کا ذہن کے نہاں خانوں سے نکل کر قرطاس پر بکھرنے کا عمل ہے جو جاری وساری ہے اور ہمیشہ رہے گا۔اسی سوچ کو شاعر ایک خاص پیمانے پر ناپتے ہوئے دلکش

انداز میں شعر کہتا ہے۔ وہ الفاظ تراشتا نہیں بلکہ زبان میں موجود تراشیدہ الفاظ کو موتیوں کی طرح مزین کرتا ہے۔ وہ الفاظ جو کہنے والے کے دل سے نکل کر سننے والے کے کانوں سے ٹکرا کر دل میں بستر لگا لیتے ہیں۔ بقول پروفیسر محمود الحسن شاکر:

"شاعری ذات کا اظہار ہے یا اردگرد پھیلی زندگی کا عکس، ان ہر دو صورتوں میں شاعر کو معتبر بناتا ہے۔ فرضی خیالات جذبات سے عاری ہوتے ہیں تاثیر سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ بزرگوں نے یونہی نہیں کہا تھا "سانچ کو آنچ نہیں" (1)

یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ انسانی فکر اور رویوں میں علاقے کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ شہر سیالکوٹ علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ اس کی فضائیں اور ہوائیں اپنے اندر قوت تخلیق رکھتی ہیں جو قالب میں ڈھلتی ہیں تو اقبال و فیض پیدا کرتی ہیں۔ خصوصاً شعر و ادب کے حوالے سے شہر سیالکوٹ کی مردم خیز اور عطر بیز مٹی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ اس دھرتی پر مرد مومن علامہ اقبال اور فیض احمد فیض کے بعد کسی اور حوالے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

فرخندہ رضوی نے بھی انہی ہواؤں اور فضاؤں میں پرورش پائی ہے۔ ایک حساس طبیعت ہونے کے ناطے ان میں ذوق علم و ادب و شاعری نے اپنی ایک جگہ بنالی ہے اور ان کا قلم بطور شاعرہ اور ادیبہ بین الاقوامی سطح پر تسلیم شدہ ہے۔ فرخندہ کا پورا نام فرخندہ بٹ تھا۔ جو شادی کے خوبصورت بندھن میں بندھ جانے کے بعد فرخندہ رضوی میں ڈھل گیا۔ قلمی نام خندہ ہے۔ چار مارچ 1956 کو سیالکوٹ کے کشمیری محلے میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ سے ہی حاصل کی۔ جو تھرڈ ایئر سے آگے نہ بڑھ سکی اور شادی ہوگئی۔ بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا۔ 1980ء سے باقاعدہ لکھنے کا آغاز کیا اور آج تک اس شوق کو لفظوں کے نت نئے پہناوے پہنانے میں پوری آب و تاب سے مصروف عمل ہیں۔ فرخندہ رضوی خود اپنے بارے میں لکھتی ہیں:

"اپنی تحریروں کی پذیرائی سے میرا حوصلہ بڑھا اور میں نے قلم کی طاقت سے لفظوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ میں لفظوں کے سمندر

میں اپنا عکس دیکھتی اور اپنی ان سطور میں زندگی کا عکس بھرنے کی کوشش کرتی۔ میں اپنی تحریر سے جانی پہچانی جاتی ہوں میری اس سوچ نے مجھے اس فیصلے تک پہنچایا کہ میرے لفظوں کو زندہ رہنا چاہیے تب میرے لکھنے کی عمر بڑھنے لگی اور خواہش شدت اختیار کرنے اور دعا بننے لگی"(2)

فرخندہ رضوی لندن میں مقیم پاکستانی نژاد، کالم نگار، افسانہ نگار، تبصرہ نگار، محقق اور بہترین شاعرہ ہیں۔ کثیر الجہات شخصیت کی مالک پرکشش خاتون ہیں۔ حسن ظاہر و باطن کی دولت سے مالا مال ہیں۔ نہایت شیریں زبان اور مہمان نواز شخصیت کی مالک ہیں۔ ان کی سب سے اچھی خوبی یہ ہے کہ انہیں مطالعہ کا بہت شوق ہے۔ وہ نہ صرف کتابیں پڑھتی ہیں بلکہ دوسروں کی کتابیں پڑھ کر ان پر اپنی رائے کا اظہار بھی کرتی ہیں اور یہ اظہار صرف زبانی ہی نہیں ہوتا بلکہ تحریر کر کے محفوظ کر لیتی ہیں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بعض لکھنے والے وسیع القلب نہیں ہوتے اور دوسرے ساتھیوں کی تحریروں کو سراہنے میں بخل سے کام لیتے ہیں کیونکہ کسی دوسرے ادیب ساتھی کی محنت سے لکھی گئی تحریر پر حوصلہ افزائی کرنے اور اچھی بات کی تعریف کرنے کے لئے بھی بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن فرخندہ رضوی یہ کام بھی سلیقے اور محبت سے کرتی ہیں۔ کیونکہ ان کا دل صاف بھی ہے اور کشادہ بھی۔ بقول امجد مرزا امجد:

" آپ ایک وسیع النظر، کشادہ ذہن، کشادہ قلب، عمیق مطالعے اور گہرے مشاہدے کی مالک ہیں۔ جس کا ثبوت ان کی کتابوں کے ایک ایک لفظ میں پوشیدہ ہے۔ افسانہ لکھتی ہیں تو دنیا جہاں کے دکھ سمٹ کر صفحہ قرطاس پر بکھر جاتے ہیں اور قاری کہانی پڑھ کر اپنے آپ کو تلاش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ جب شاعری کرتی ہیں تو وہی صفحات پر بکھرے ہوئے طویل مضامین سمٹ کر دو مصروں میں قید ہو کر رہ جاتے ہیں اور قاری دم بخود ہو جاتا

ہے"(3)

شاعری ایک ایسا ہنر ہے جو نہ صرف احساسات کو قوت بیان دے کر حیات دیتا ہے بلکہ سننے اور پڑھنے والوں کو بھی زندگی کے نئے مزے چکھاتا ہے۔ لفظوں کو زندگی دینا اور احساسات کو قوت بیان عطا کرنا ہی شاعری کی معراج ہے۔ گو یہ کام بہت دشوار ہے مگر یہ ہماری خوش قسمتی کی دلیل ہے کہ اس مشکل اور دشوار گزار کام کو سہل بنانے والے باکمال لوگ ابھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ایسے باکمال، ہنرمند اور قلم کو اپنے خون جگر سے سینچنے والوں کی صفِ اول میں فرخندہ رضوی کا نام بھی آتا ہے۔ وہ اپنے عہد کی سچی ترجمان شاعرہ ہیں۔ ان کی شاعری صرف روایتی حسن و عشق کا مرقع ہی نہیں بلکہ اپنے اردگرد ہونے والے حالات و واقعات کو نہایت خوبصورتی سے موضوعِ سخن بناتی ہیں۔ ان کی شاعری خوبصورت تشبیہات و استعارات کے ماہرانہ استعمال سے سجی سنوری نظر آتی ہے ہے جو قاری کے دل پر ان مٹ نقوش ثبت کرتی ہے۔ بقول ضیاء شہزاد:

اہل نظر ہیں اہل سخن اور ذی وقار
ہیں شاعرہ، ادیبہ بھی وہ سفر نگار
فرخندہ رضوی بزم سخن کی ہے ایک شان
ان پر ہمیشہ مہرباں ہے میرا کردگار

(4)

فرخندہ رضوی اپنے قلم کی طاقت سے سماجی مسائل جیسے مرد کی بے وفائی، مظلوم عورت، خونی رشتوں میں خلوص کا فقدان، عشق و محبت، غربت و افلاس، بے حسی، خودغرضی وغیرہ کو معاشرے کے سامنے بے نقاب کیا ہے۔ وہ معاشرے کی سچی عکاس شاعرہ ہیں۔ ان کی تحریروں میں متنوع موضوعات ہیں اور یہ سب ان کا انسانی نفسیات پر مکمل عبور کا ثبوت ہے وہ نثر لکھتی ہیں تو لاجواب، وہ شاعری کرتی ہیں تو بے مثال، وہ گفتگو کرتی ہیں تو باکمال۔ بقول فرحت عباس شاہ

''فرخندہ رضوی کی شاعری سادہ، معصوم، سچی، اور محبت سے
بھری ہوئی ہے۔ ان کی شاعری میں بھاری بھرکم الفاظ اور وزنی

خیالات کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ وہ نہایت سلیس انداز میں حال
دل بیان کرتی چلی جاتی ہیں۔ بحروں کا انتخاب اور قافیہ ردیف
کا تو تعین ان کے بناوٹ سے پاک طرز اظہار سے میل کھاتا
ہے۔ دردمندی اور رشتوں کا تقدس ان کی شاعری اور ذات
دونوں کا خاصہ ہیں"(5)

فرخندہ رضوی سیالکوٹ سے انگلینڈ کی طرف شاید اس نظریے کے تحت عازم سفر ہوئیں تھیں کہ کچھ پانے کیلئے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ انہوں نے جنم دینے والی مٹی سیالکوٹ کو کھو کر علم و آگہی کے وہ خزانے حاصل کر لیے ہیں، جن کی تلاش میں انہوں نے رخت سفر باندھا تھا۔ آج بھی وہ سیالکوٹ کی سوندھی مٹی کی خوشبو کو محبت سے یاد کرتی ہیں۔ لیکن جو نام اور شہرت ان کو ملی ہے اس کے لیے یہ دوری یہ قربانی ضروری تھی۔ فرخندہ رضوی وطن سے محبت کا اظہار یوں کرتی ہیں:

تجھ پر ہوں فدا میرے جان و تن
میرے پیارے وطن اے پاک وطن
(6)

فرخندہ رضوی نام ہے اس ہمہ جہت شخصیت کا جو افسانہ، نظم، غزل غرض ہر صنف ادب پر استقلال و استقامت سے طبع آزمائی کرتی نظر آتی ہیں۔ برطانیہ کے ادبی حلقوں میں بطور شاعرہ، کامیاب کالم نگار اور بہترین افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنی پہچان کروا چکی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ ریڈنگ کی ہی نہیں بلکہ پورے برطانیہ کی معروف مقبول تخلیق کار ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

برطانیہ اور اس کے پڑوسی ممالک میں شائد ہی کوئی ادبی تقریب ہوئی جس میں فرخندہ رضوی اپنی غزل، نظم، افسانے یا کالم کے ساتھ شریک نہ ہوتی ہوں۔ ان کے کام کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ برطانیہ میں اردو ادب کا متحرک استعارہ ہے۔ وہ ایک ایسی بھرپور آواز ہے جسے نظر انداز کرنا بہت مشکل ہے۔ فرخندہ رضوی صاحبہ ایک ادبی شخصیت ہی نہیں بلکہ ایک سماجی شخصیت بھی ہیں۔ ان کی شخصیت تہہ در تہہ پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔ ان کی ذات کا ہر پہلو منفرد شناخت رکھتا ہے۔

ہر مسلمان کے ایمان کی بنیاد اسلام سے ہے۔ مسلمانوں گھرانوں میں تین یا چار سال سے دینی تعلیم دینے کا آغاز کر دیا جاتا ہے۔ اسلام خالی زبانی وکلامی مسلمان ہونے کا نام نہیں بلکہ اسلامی شریعت کے مطابق عملی طور پر نافذ کردہ اصولوں کے مطابق اپنی زندگی کو ان اصولوں کے مطابق ڈھالنے کا نام ہے۔ دینی تعلیم کے حوالے سے فرخندہ رضوی بچپن میں قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے حوالے سے بتاتی ہیں:

"ماں باپ کی تربیت اولاد کی پہلی درسگاہ ہے۔ وہ ہمیشہ کوشش کرتے ہیں کہ بچوں کو اپنے وقت پر دینی اور دنیاوی تعلیم سے آشنا کیا جائے۔۔۔ ہم سب بہن بھائیوں نے سات سال کی عمر میں قرآن پاک ختم کیا۔۔۔ نوراں بی بی سے ہم نے قرآن پاک پڑھا اور ہماری والدہ سے دوسرے بچوں نے۔۔۔۔"(7)

فرخندہ رضوی تازہ واردان بساط شعر ہیں۔ یہ بات ہم پاکستانیوں کے لیے باعثِ مسرت ہے کہ انگلستان میں نہیں بلکہ دنیا کے کسی بھی خطے میں اردو ادب کی آبیاری کرنے والوں اور اردو ادب کے فروغ میں کوشاں اردو زبان کی ترقی و ترویج کرنے والوں کا خیر مقدم زور و شور سے کرنا چاہیے۔ خصوصا وہ لوگ جو پاکستان سے باہر یورپ اور امریکہ میں بیٹھ کر اردو کی آبیاری کر رہے ہیں۔ اردو کے فروغ کے لئے دن رات کوشاں ہیں، خصوصی مبارکباد کے مستحق ہیں کیونکہ یہاں اردو دان طبقہ بہت تیزی سے سکڑتا اور سمٹتا جا رہا ہے۔ پاکستان میں بچوں کی زبان اردو نہیں انگریزی ہے۔ اکثر بچے اردو میں شعر کہہ سکیں یا سمجھ سکیں مشکل ہے۔ وہ تارکین وطن جو اپنے ساتھ اردو لے کر آئے تھے تاریخ کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ بقول انشاءاللہ خان انشاء

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
(8)

شاعری کا دوسرا نام محبت ہے۔ محبت پاکیزہ جذبوں کے احساسات کو کہتے ہیں۔ شاعروں نے شاعری کے ذریعے محبت کے پیغام کو عام کیا ہے۔ جبکہ اہل ہوس لوگوں نے محبت کو بدنام کیا ہے۔ بقول غالب:

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوہ اہل نظر گئی

(9)

شاعروں نے ہمیشہ لسانی، گروہی، مذہبی اور علاقائی تنازعات ومناقشات سے صرف نظر کیا۔ محبت کو زندگی اور زندگی کو محبت جانا۔ انسانیت کو مذہب گردانا۔ محبت کے گیت گائے اور محبت کے ساز کو دل کے راگ سے گنگنایا۔ محبت پانے کا نہیں بلکہ کھونے کا نام ہے۔ کیونکہ دسترس میں آنے کے بعد کسی بھی چیز کی وقعت باقی نہیں رہتی۔ تاریخ شاہد ہے کہ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، سوہنی مہینوال اور سسی پنوں وغیرہ جیسے عاشقوں کی محبت امر ہوئی۔ کیونکہ درحقیقت محبت پانے کا نہیں بلکہ کھونے کا نام ہے۔ اس محبت کو بنیاد بنا کر شاعری تخلیق ہوئی۔ اگر محبت نہ ہوتی تو شائد شاعر نہ ہوتے کیونکہ شاعر حضرات محبت ہی کی پیداوار ہیں یقیناً محبت کے جذبے پر ہی دنیا قائم ودائم ہے۔ فرخندہ رضوی محبت کا فلسفہ کچھ یوں بیان کرتی ہیں:

محبت میں ہوتا ہے مٹنا مٹانا
محبت ہے دانستہ دل کو دکھانا
محبت ہے شعلوں میں دل کو جلانا
محبت کا دشمن ہے سارا زمانہ

(10)

کتنی ستم ظریفی کی بات ہے کہ ہر طرف خوف و ہراس اور نفرت و کدورت کی سیاہ رات کا دور دورہ ہے۔ محبت پر پابندیاں ہیں اور نفرت آزاد ہے۔ حالانکہ محبت جتنی بھی زیادہ ہو کم ہے اور نفرت کم بھی ہو تو زیادہ ہے۔ غیرت کے نام پر آج بھی قتل ہو رہے ہیں۔ مشرق کی سرزمین آج بھی اہل دل پر تنگ اور باعث ننگ ہے۔ اہل زور و زر دریائے عیش وعشرت میں غوطہ زن ہیں۔ ایسے

گھٹے گھٹے ماحول میں فرخندہ رضوی بے اختیار پکار اٹھتی ہیں:

کب سے سسک رہی تھی جہالت کے غار میں
علم و عمل سے ہم نے ابھاری ہے زندگی
(11)

آزار محبت آلام محبت کو جنم دیتا ہے۔ انسان کش ماحول میں جذبات و احساسات کچل دیے جاتے ہیں۔ انگریز شاعر جان کیٹس JohnKeats اپنی محبوبہ فینی براؤن FannyBrown کے ہجر میں عالم شباب ہی میں نذر مرگ ہوا۔ غم ہجراں اصل میں غم انسان ہے۔ انسان کا مقصد ہی انس ہے اور انس کے سوتوں سے ہی لفظ محبت پھوٹتا ہے۔ گویا انسان صاحب محبت کو کہتے ہیں۔

فرخندہ رضوی کی شاعری بھی سیاسی، سماجی اور ادبی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان کی شاعری میں درد ہجراں، غم دوراں اور فکر انسان کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ وہ اپنے دل میں ساری انسانیت کے لے درد دل کا جذبہ رکھنے والی ہستی ہیں۔ کیونکہ یہ درد دل کا احساس ہی انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا ثبوت ہے۔ نور احمد کنڈے (ٹیلفورڈ) انگلینڈ لکھتے ہیں:

"برطانوی دختر پاکستان آزاد نظم کی معروف شاعرہ فرخندہ رضوی بنیادی طور پر پابندی سے مبرا آزاد نظم کی شاعرہ ہیں۔ فرخندہ کی نظمیں "نوائے وقت لندن" میں پابندی سے شائع ہوتی رہی ہیں اور ہزاروں قارئین ان کی شاعری سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ان کا اپنا ایک مخصوص طرز تحریر ہے۔ یہی فرخندہ کی پہچان ہے فرخندہ نے بہت سے موضوعات کو نظم کیا ہے۔ ان میں اداسی، تنہائی، پھول، آنسو، خوشبو، محبت، انتظار، بیقراری، ظلمت و اجالا، ہادو بارش، خار و خس، ربط عشق، پکار و التجا، خواب و ہیئت، یار، دوستی کی آگ، رشتے و فاصلے، برسات، چراغاں، اور کیا کیا ہے جو موجود نہیں۔۔۔۔۔"(12)

فرخندہ رضوی اپنے نام کے لغوی معنی کی طرح ہیں۔ مبارک، خوش آئند، برکت والی، سعادت مند، نیک سیرت۔ آپ کا تعلق ایک ادبی گھرانے سے نہ ہونے کے باوجود آپ کی اردو ادب سے محبت نے ادب کے ذوق کو جلا بخشی جو کہ اردو ادب کی ترویج کے لیے مبارک ثابت ہوئی۔ آپ اسم با مسمی ہیں۔ بہت کم ایسی ہستیاں ہوتی ہیں جن کے نام ان کی زندگی کے بھرپور عکس ہوتے ہیں۔ فرخندہ رضوی بھی انہی خوش نصیبوں میں سے ہے۔ مگر یہ خوش نصیبی ہر ایک کے مقدر میں نہیں ہوتی۔

ہمارے معاشرے کا المیہ بدقسمتی سے یہ ہے کہ نئے شاعروں اور شاعرات کو ابتدائی اصلاح سازی کے لئے تجربہ کار لوگوں کی مدد درکار ہوتی ہے یا انہیں ایسے پلیٹ فارم کی تلاش ہوتی ہے جہاں ان کی اصلاح کے ساتھ ساتھ رہنمائی بھی میسر آ سکے۔ مگر اول تو ایسے تجربہ کار لوگ کم ہی دستیاب ہوتے ہیں، دوسرے اگر ہوتے بھی ہیں تو ان سے وقت لینا نہایت دشوار ہوتا ہے اور کچھ لوگ طبیعتاً لیے دیے والی کیٹگری سے تعلق رکھتے ہیں ان کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔ ایسی صورتحال میں نئے شاعر علم عروض سے ناواقفیت کی بنا پر ردیف، قافیہ اور بحروں کے چکر میں باوجود موزوں سخن طبع اپنے ہنر کو خوار کرتے ہیں اور بالآخر مایوس ہو کر شعر و شاعری کو ترک کر دیتے ہیں۔ بدقسمتی سے ایسے ہی حالات سے فرخندہ رضوی کو بھی گزرنا پڑا۔ نہ پڑھا لکھا گھرانہ نہ ادبی ماحول کی دستیابی اور نہ ہی کسی قسم کا تعاون و مشاورت۔ ایسی صورتحال میں ان پر شوق قلم کا جنون حاوی رہا اور ایسے حالات کے باوجود وہ لکھتی رہیں اور اپنے شوق جنون کو لیے ادبی راہوں پر بغیر سہارا لیے لفظوں کے موتیوں کو پروتی رہیں مگر کبھی ہمت نہ ہاری۔ ادبی سفر کے حوالے سے فرخندہ رضوی لکھتی ہیں:

> "میں نے اپنے ادبی سفر کو بہت مشکل طے کیا کیونکہ نہ تو میرا کسی ایسی فیملی سے تعلق تھا، جہاں اردو ادب پلتا ہے آباؤ اجداد میں دور دور تک کوئی ایسی روشنی نہ ملی۔ جس سے میں کچھ کرنیں اپنے نام کر لیتی۔ مگر میرے شوق نے اردو سے محبت نے میرے قلم کو زنگ آلود نہ ہونے دیا" (13)

ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھنا انسانی فطرت ہے۔ تاریخ کا فہم و ادراک تخلیقی تجربے میں پختگی

اور معنی آفرینی کا سبب بنتا ہے۔ عمر کی زنجیر جتنی طویل ہوگی انسان کے تجربات اس کی سوچ کے دھاروں کو مضبوط کرتے جاتے ہیں۔

2013 میں شہر ریڈنگ میں اردو ادب سوسائٹی کی جانب سے ایک مشاعرہ منعقد ہوا، جس میں اعلیٰ پایہ کے شاعروں ساتھ ساتھ فرخندہ رضوی کو بھی اپنی شاعری پڑھنے کا موقع ملا۔ اسی مشاعرے میں جہاں بہت سے شعراء سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ وہیں فرخندہ کو خالد یوسف صاحب سے ملنے کا موقع بھی ملا اور یہ ملاقات ان کے لئے کسی اعزاز سے کم نہ تھی۔ خدا حافظ کہتے کہتے مسکرا کر بولے کہ اچھا لکھتی ہو۔ تمہاری شاعری اور افسانے دونوں ہی نظر سے گزرتے رہتے ہیں۔ لکھتی رہا کرو خود بخود نکھار آنے لگے گا۔ فرخندہ رضوی کہتی ہیں کہ ان کے وہ حوصلہ افزائی کے چند الفاظ مجھے بہت بلندی پر لے گئے مجھے لگا کہ میرے قلم کو انہوں نے طاقت دے دی ہو۔ یہ ان سے میری پہلی ہم کلامی تھی۔

گزرتے وقت نے محترم خالد یوسف کو میرا پہلا استاد بنایا۔ جنہوں نے شفقت سے میری شاعری کی اصلاح کی۔ مجھے علم عروض کی طرف راغب کر کے بحروں کی پہچان کروائی، اور شاعری کے رموز و اوقاف سے روشناس کروایا۔ دوسرے محترم صفدر ہمدانی صاحب میرے لئے مقدس ہستی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جنہوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی فرمائی۔ میری غلطیوں کو اصطلاحی پہناوے پہنا کر لفظوں کو خوبصورتی عطا کی۔ کہتے ہیں کہ محبتوں کے قرض چکائے نہیں جا سکتے۔ اس لیے کہ وہ اس جملے کی صداقت پر کامل یقین رکھتی ہیں، اور وہ کہتی ہیں کہ میں اپنے اساتذہ کا شکریہ ادا کر کے ان کی محبتوں، شفقتوں اور رہنمایوں کے قرض کو چکانا نہیں چاہتی بلکہ قرض کو سر پر لے کر ہر دم دعاؤں کے تحفوں کے ذریعے ساری زندگی ان کے لئے خیر و دعا کی طالب رہوں گی۔

فرخندہ رضوی ان دو ہستیوں کو خصوصی طور پر ہر دم دعاؤں میں یاد رکھتی ہیں۔ جنہوں نے شاعری کے سفر میں قدم قدم پر رہنمائی فرمائی۔ ان اساتذہ کے خلوص شفقت اور محبت بھری اصلاح سے ان کے لیے شاعری کے دریچے کھلتے چلے گئے اور آج وہ شاعری کے سارے رموز و اسرار سے واقف نظر آتی ہیں۔ فرخندہ اپنے محترم اساتذہ کے بارے میں لکھتی ہیں:

"میرے استاد محترم خالد یوسف صاحب (مرحوم) جن کا ذکر نہ کرنا سراسر بے انصافی کے زمرے میں آتا ہے۔ اس ہستی میں مجھے علم عروض کی طرف راغب کیا۔۔۔۔۔ اپنے دوسرے استاد محترم صفدر ہمدانی صاحب کی بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے مسودوں کو غور سے پڑھا، املا کی غلطیوں کی درستی فرمائی، کلام کو شاعرانہ استادانہ نظر سے دیکھا۔۔۔ جہاں اصلاح کی ضرورت محسوس ہوئی وہاں نشاندہی کی، میں ان کی اس محبت کے لیے بے انتہا ممنون ہوں۔۔۔"(14)

کسی بھی ادب کو تخلیق ہونے کیلئے زبان کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ زبان دانی کے بغیر ادب کا وجود ممکن نہیں۔ بالکل ایسے جیسے پھولوں کو کھلنے کے لیے بہار کی آمد کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ شاعر ہر دور میں پیدا ہوتے ہیں اور اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنے کلام کے ذریعے اپنے عہد کی عکاسی کرتے ہیں۔ کچھ شاعروں کے کلام میں بڑی تاثیر ہوتی ہے جو قارئین کے دلوں کو نہ صرف بھاتی ہے بلکہ دل میں بسیرا کر لیتی ہے۔ غالب اور اقبال جیسے عظیم نامور شاعروں کے بعد فیض احمد فیض، حبیب جالب، فراز، بشیر بدر، جون ایلیاء، ساغر صدیقی اور دوسرے کئی شعراء نے اپنے اپنے دور کے سیاسی، ثقافتی اور ادبی حالات و واقعات کو اپنے لفظوں کے خوبصورت سانچوں میں ڈال کر پیش کیا اور زمانے سے داد تحسین کے مستحق قرار پائے۔ بعض شعراء نے اپنے کلام کی بدولت آسمان کی بلندیوں کو چھو لیا اور کچھ کے مقدر میں گمنامیوں کے اندھیرے لکھ دیئے گئے ہیں۔

پاکستانی نژاد فرخندہ رضوی دیار غیر (برطانیہ) میں بیٹھ کر اردو ادب کی آبیاری میں عرصہ چھتیس (36) برس سے مصروف عمل ہیں۔ شادی سے پہلے جس گھر میں ہوش سنبھالا وہاں نہ تو تعلیم کا خاص رواج تھا اور نہ ہی شاعری کا ماحول۔ والد عبدالرشید بٹ صاحب ایک کاروباری شریف النفس انسان تھے۔ انہیں نہ تو فلمیں دیکھنا پسند تھا اور نہ ہی شاعری کے لگاؤ کو پسند کرتے تھے۔ اس لحاظ سے بچوں پر کڑی نگرانی تھی۔ سیانے سچ ہی کہتے ہیں:

شوق دا کوئی مل نئیں ہوندا
پہرے وچ وی راہ بنا لیندا

فرخندہ رضوی اپنے شوق قلم کو ہوا دیتی رہیں اور چپکے چپکے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ جب وہ 1983ء میں برطانیہ اپنی بڑی بہن عظمت کو ملنے گئیں تو حالات و اتفاق ایسا ہوا کہ وہیں 1984ء میں ان کی شادی بشیر رضوی صاحب کے ساتھ ہوگئی تب وہ فرخندہ بٹ سے فرخندہ رضوی بن گئیں۔ شادی کے وقت بشیر رضوی کے والدین حیات نہیں تھے۔ فرخندہ نے اس مقدس رشتے کو نہ صرف دل سے قبول کیا بلکہ ہر ذمہ داری کو بخوبی نبھایا۔ شوق عشق میں قلم و کاغذ پر نقوش کا سلسلہ گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ جاری رکھا۔ آج تک سنا تھا کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس ہوا۔

فرخندہ رضوی کی کامیابی کے پیچھے ان کے شوہر بشیر رضوی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ یہ ان کی محبت، شفقت اور تعاون کرنے کا ہی نتیجہ تھا کہ فرخندہ رضوی آج کامیاب شاعرات میں مانی جاتی ہیں اور یہ ان کے شوہر کا ایک اچھا انسان ہونے کا ثبوت ہے۔ اب اس مقولے کو بھی سند مل جانی چاہیے:

ہر کامیاب عورت کے پیچھے اس کے شوہر کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے۔

محمد بشیر رضوی صاحب نے ان کے شوق قلم میں کوئی رکاوٹ حائل نہ کی۔ وہ نہایت بردبار، نرم دل اور نفیس انسان ہیں۔ فرخندہ رضوی نے برطانیہ کے ہر نیوز پیپر کے ادبی صفحات میں شاعری، افسانے، سچی کہانیاں، کالم حتیٰ کہ ہر صنف ادب پر لکھا اور ادبی جرائد کے پلیٹ فارم پر اپنا ادبی سفر جاری و ساری رکھا اور آج تک اپنے اس سفر میں کامیابی کے ساتھ گامزن ہیں۔ بانو ارشد "زیر لب خندہ" کے اظہار خیال میں لکھتی ہیں:

"فرخندہ بہت محنت سے اردو کی خدمت میں مگن ہے۔ خواہ وہ شاعری ہو یا نثر نگاری اس میں مشق سخن جاری ہے اور ان کی اس بے پناہ عقیدت جو ان کو اپنے وطن و مذہب سے ہے۔ خداوند کریم سے دعا ہے کہ ان کا یہ سفر اسی طرح جاری رہے اور یہ اردو کو

فروغ دینے میں راہ ادب میں گامزن رہیں۔ یقیناً یہ اردو کی
سرزمین میں سرسبز ثمر اور شجر پیدا کر کے زمانہ ادب کے دانشوروں
اور فنکاروں کی نقد میں اپنی دھاک بٹھالیں گی"(15)

فرخندہ رضوی نہ صرف برطانیہ بلکہ پاکستان، یورپ، انڈیا اور دیگر ممالک میں ادیبہ اور شاعرہ اپنی پہچان بنا چکی ہیں۔انہوں نے ان ممالک کے ادبی صفحات پر اپنی بطور شاعرہ، ادیبہ، کالم نگار، افسانہ نگار اور تجزیہ نگار جگہ بنالی ہے۔قلم کی طاقت بڑھی تو راستے ملتے گئے اور پہچان مستحکم ہوتی گئی۔ کچھ سلسلے کمپیوٹر نے آسان بنا دیے۔ کچھ سوشل میڈیا نے رول ادا کیا اور یوں آن لائن اخبارات، رسالے، پی ڈی ایف فائلوں کا سلسلہ حتی کہ فیس بک کی بدولت ان کا حلقہ احباب بڑھا اور یوں یہ سلسلے دراز ہوتے گئے۔فرخندہ رضوی اس ضمن میں کہتی ہیں:

''میری کتابوں کی اشاعت سے کتابوں کی رونمائی تک میرے
دونوں بچوں اور میرے شریک حیات نے ہمیشہ میرے ساتھ
بھرپور تعاون کیا۔اگر یہ ساتھ نہ دیتے تو شاید میرا قلم کب کا دم توڑ
چکا ہوتا۔ میرے الفاظ راکھ بن چکے ہوتے۔۔۔۔ احسان مند
ہوں اپنے گھر والوں کی۔۔۔میرے خیال میں مفادات اور غرض
سے ہٹ کر رشتوں کو چاہا جائے حسین سے حسین تر ہوتے چلے
جاتے ہیں۔اس رنگینی میں رنگ بھرنے میں سب سے بڑا ہاتھ
میرے شوہر کا ہے"(16)

اپنے شوہر کی محبتوں اور مہربانیوں کے اعتراف میں انہوں نے اپنی خوبصورت تخلیق "فاصلے ستا رہے ہیں" کا انتساب اپنے محبوب شوہر کے نام سے کیا۔ یہ ان کی طرف سے محبتوں بھرا جوابی ردعمل تھا۔اگرچہ محبتوں کو کسی پیمانے میں تولا نہیں جا سکتا ہے۔آج تک کوئی ایسا پیمانہ نہیں بن سکتا جس سے محبت کی پیمائش ممکن ہو۔محبت کے کئی روپ ہوتے ہیں محبت کبھی محبوب سے ہوتی ہے تو کبھی ماں باپ سے سے، کبھی اولاد سے اور کبھی یہ محبت دوستوں اور رشتہ داروں کی طرف نظر عنایت

کر لیتی ہے۔فرخندہ رضوی کا عشق اور محبت کے بارے کہنا ہے:

"عشق کا لفظ برہنہ ہے ہم سوچتے ہیں کہ ایک مرد کو عورت سے یا عورت کو مرد سے ہی ہوسکتا ہے۔ میرے خیال میں ایسا ہرگز نہیں۔۔۔۔ اس کا دارومدار آپ کی نیت پر ہوتا ہے۔ مجھے عشق اپنے والد سے ہوا۔ اپنی اماں سے ہوا۔ میرے رب نے میری ماں کی تمام ذمہ داری شروع سے ہی مجھ پر ڈال دی تھی۔ اس کے علاوہ ایسے رشتے جو دل کی شریانوں میں خون بن کر گردش کرتے ہیں مجھے ان رشتوں سے عشق ہوا" (17)

شعر وسخن، فکر وفن، نقد ونظر اور دیدہ ودانش کے ذیل میں فرخندہ رضوی کا نام ایک معروف اور معتبر نام ہے۔ان کی شاعری ان کے افسانے متعدد ادب پاروں پر ان کے نقد نامے قارئین کی نظر میں ایک اہمیت اور اعتبار قائم کر چکے ہیں۔گزشتہ تین دہائیوں سے انھوں نے خود کو قلم گسار (غم گسار کی طرح) بنا رکھا ہے۔ان کی زندگی میں مسائل وامتیاز سے نپٹنے کا ایک ہی ہتھیار ہے اور وہ ہے ان کا قلم، ان کے قلم کی جولانیاں ملاحظہ ہوں:

طلسم توڑ دیا شب کا لاکھ سورج نے
مگر یہ صبح بھی ناپائیدار لگتی ہے
قطار بجھنے کو ہے شب زدہ چراغوں کی
نوید صبح بڑی خوشگوار لگتی ہے
(18)

فرخندہ کسی ازم کی نقیب نہیں ہیں وہ زندگی کی، انسانی دکھ کی، افراد کی، مسرتوں کی اور عزم و ہمت کی نقیب ہیں ان کی پوری شاعری اسی محور پر گھومتی نظر آتی ہے۔محبت، درد، سماجی بے راہ روی، بے انصافی جبر اور انسان کی ناقدری کی تصاویر انھوں نے اپنی غزل میں بہت خوبصورتی سے کھینچتی ہیں۔امید اور عزم کی ایسی خوبصورت جھلکیاں ان کی شاعری میں جگہ جگہ اپنا جلوہ دکھا رہی ہیں۔

فرخندہ رضوی کی نظموں کا دلکش پہلو فنی حربوں کا اچھوتا اور نادر استعمال ہے۔ خصوصاً تمثال کاری فرخندہ رضوی کا خاص فنی حربہ ہے، جس میں ان کی انفرادی اُپج کا فنی وفکری ڈھانچہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ جدید شعری تناظر میں پیکر اور تمثالیں ایسا فنی حربہ ہیں۔ جنھیں برتنے کے لیے خاص فنی مہارت اور جمالیاتی ذوق کی ضرورت ہوتی ہے۔ فرخندہ کے ہاں شعری تجربہ اسقدر اچھوتے، معنی خیز اور نئے امکانات کے ساتھ وارد ہوا ہے کہ اردو شاعری میں اس انداز کی فنی مہارت کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ فرخندہ کے ہاں یہ تمثالیں پیکر در پیکر، جذبات نگاری، سیاسی وسماجی شعور، نفسیاتی پیچ و خم، فلسفیانہ رموز وعلائم اور منطقی استدلال کی نقیب ہیں۔ جو مجرد خیالی کی بجائے حقیقی اشیاء کے نئے اور اچھوتے تفاعلی تصورات کی منظر کشی کرتی ہیں۔ بحیثیت مجموعی فکری وفنی اعتبار سے فرخندہ کی نظمیں اور غزلیں انفرادی شعور سے اجتماعی شعور کی جانب گامزن ہیں۔ فکری تنوع اور اسلوبیاتی اعتبار سے یہ نظمیں اور غزلیں جدید شعری منظر نامے کی عکاس ہیں۔

برطانیہ میں مقیم اردو ادب کی معتبر شخصیت، شاعر، ادیب جناب صفدر ہمدانی نے اپنے مضامین میں فرخندہ کی پانچ اہم ترین خوبیوں کا ذکر کیا ہے ہے۔ جو آج صاحب استطاعت اور بزعم خود ادبی حضرات میں بھی ختم ہوتی جارہی ہیں۔ مگر فرخندہ ان روایات کو احسن طریقے سے زندہ رکھے ہوئے ہے۔

پہلی خوبی:

تعلقات عامہ اور مفاد پرستی کے اس دور میں فرخندہ اصول پرستی کا نقصان برداشت کرنے والی اہم شخصیت ہیں۔

دوسری خوبی:

فرخندہ کو مطالعے کا شوق ہے جو اس عہد میں اہل ادب سے عنقا ہے۔

تیسری خوبی:

فرخندہ رضوی کو کتاب خرید کر پڑھنے کا شوق ہے اور اس کی سب سے زیادہ دوستی کتاب سے ہے۔

چوتھی خوبی:

فرخندہ موروثی قلم کار نہیں بلکہ یہ مقام سخت محنت سے بنایا ہے۔

پانچویں خوبی:

وہ سیکھنے کے ساتھ ساتھ پوچھنے سے کبھی دریغ نہیں کرتیں کہ یہی عمل دراصل اس کی قوت متخیلہ کو مہمیز دیتا ہے۔ بقول محمد اشفاق ایاز:

> " کسی کی ادبی صلاحیتوں کو سراہنا، ان کا اعتراف کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے یہ کام بے لاگ طریقہ سے وہی شخص کر سکتا ہے جس کے دل میں کسی کے خلاف کینہ، حسد اور بغض نہ ہو۔۔ ادبی گروپ انہیں خوبیوں سے متصف ہیں۔ ان کے مقابلے میں فرخندہ ایک کھلے دل کی مالک تخلیق کار ہے"(19)

شاعری انسانی مزاج وفطرت سے نمو پاتی ہے یہ باہر سے کم اور اندر سے زیادہ ظاہر ہوتی ہے۔ اس لیے کوئی چاہے بھی تو اس سے اپنا آپ چھپایا نہیں جا سکتا۔ فرخندہ رضوی کی شاعری اس لیے نہایت سادہ اور معصومیت بھری ہے کہ وہ خود ایسی ہی ہیں۔ سادہ، معصوم، سچی اور محبت سے بھری ہوئی ان کی شاعری میں بھاری بھرکم الفاظ اور وزنی خیالات کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ وہ نہایت سلیس انداز میں حال دل بیان کرتی چلی جاتی ہیں۔ بحروں کا انتخاب اور قافیہ وردیف کا تعین ان کے بناوٹ سے پاک طرز اظہار سے میل کھاتا ہے۔ دردمندی اور رشتوں کا تقدس ان کی شاعری اور ذات دونوں کا خاصہ ہیں۔

فرخندہ رضوی اپنوں کے دیئے ہوئے غموں کے لمس سے آشنا ہیں۔ انہیں جو دکھ اپنے سگے رشتوں سے ملتا ہے وہ رشتے جن پر ہر انسان آنکھ بند کر کے بھروسہ کرتا ہے۔ لیکن جب خونی رشتے ہی رنگ بدل لیں تو دنیا کے ہر خطے سے اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ اور انسان کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ اپنے دکھ درد کو فرخندہ نے ایسے بیان کیا ہے کہ پڑھنے والے کو اس میں اپنا ہی دکھ نظر آنے لگتا ہے۔ یہ ہمارے سماج کی بہت بڑی حقیقت ہے کہ رشتوں میں مخلصی ختم ہوگئی ہے۔ اور رشتہ مطلب اور غرض سے جڑ گیا ہے۔ بغیر مطلب کے کوئی کسی کا سگا نہیں ہے۔ غرض کہ خونی رشتوں میں بھی غرض کی ملاوٹ ہوگئی ہے۔ اور یہ ہمارے معاشرے کا بہت بڑا المیہ ہے، بقول فرخندہ رضوی:

ممکن جو ہوئی ہم سے وہ تدبیر کرے ہیں
جو زخم ہرے تھے ہاں ابھی تک وہ ہرے ہیں
بتلاؤ تو رکھیں بھی کہاں غم کے دفینے
برتن جو میسر تھے ہمیں سارے بھرے ہیں

(20)

فرخندہ رضوی نے اپنی محنت سے اپنا خاص مقام بنایا ہے۔ کتاب وقلم سے دوستی انسان کو کبھی تنہا نہیں ہونے دیتی ہے۔ مگر یہ رفاقت انسان کو عجب منزل کا مسافر بنا دیتی ہے۔ جب تک فرخندہ رضوی دعاؤں کے دست حصار میں تھی مطمئن وشاداں تھی۔ اپنی ماں سے محبت فرض نہیں عبادت سمجھ کر کی ہے۔ ماں سے پیار کے معصوم رنگ اس کی تحریروں میں واضح نظر آتے ہیں۔ ان کی نظموں میں ''ماں'' ثابت کرتی ہیں کہ خیال کی تجسیم کاری کے لیے تکنیکی طور پر نئی نئی ساخت اور ہیئت اختراع کرنا بھی انہیں خوب آتا ہے۔ اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس کا ہر مصرع لفظ ''ماں'' پر ختم ہوتا ہے:

پرورش میں اُن کی ہستی تک مٹا دیتی ہے ماں
اپنے بچوں کی مگر قسمت بنا دیتی ہے ماں

(21)

فرخندہ رضوی کا اپنی ماں سے گہری محبت اور چاہت کا اظہار ان کی شاعری میں جا بجا ملتا ہے۔ ماں کی موت سے بڑا کوئی سانحہ دنیا میں رونما نہیں ہوسکتا۔ وہ اس سانحہ کو Big Loss کہتی ہیں۔ یعنی بڑا نقصان جس کا مداوا ہو ہی نہیں سکتا۔

یہ حادثہ ایک ہی پل میں گھنی چھاؤں میں ٹھہرے انسان کو ایک دم سے تپتی ہوئی دوپہر میں کھڑا کر دیتا ہے۔ اپنی ایک نظم میں سانحہ کو دلگداز انداز میں بیان کرتی ہیں:

یک بیک رت بدل گئی کیسے
آسماں کیسے ہو گیا ہے سیاہ

ماں تیری موت کی خبر سن کر
میری ہر سانس بن گئی ہے آہ

(22)

اس نظم میں جس قدر دو عالم کو فرخندہ رضوی نے محسوس کیا اسے غم کی سیاہی میں ڈبو کر کاغذ پر انڈیل دیا ہے۔ ان اشعار میں جس کرب کا اظہار ہے وہ کرب واذیت جو بے اختیار ہونٹوں سے پھسل جاتا ہے۔

فرخندہ رضوی کا خمیر اگر چہ اقبال اور فیض کی سرزمیں سیالکوٹ کی مردم خیز مٹی سے اٹھا ہے۔ مگر آج کل ان کا وطن ثانی انگلستان ہے اور وہیں رہ کر بڑی تن دہی، مستعدی، دل جمعی اور عرق ریزی سے اردو ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ وہ شاعرہ تو ہیں ہی لاجواب لیکن افسانہ نگار بھی کمال کی ہیں۔ جنہیں خالد یوسف، اکبر حیدر آبادی، صفدر ہمدانی، ڈاکٹر مختار الدین، بانو ارشد اور راحت زاہد جیسے اکابرین و مصلحین کی سرپرستی، اُن کی حمایت اور حوصلہ افزائی حاصل ہے اور یہ بڑی بات ہے۔ آج انگلستان میں آباد اردو کی عظیم بستی فرخندہ اور انہی شائقین اردو اور باذوق مہاجرین کی مرہون منت ہے۔

یہ تمام حوالے فرخندہ رضوی کو اپنے دور کی نمائندہ شاعرہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ انہوں نے ادب برائے ادب نہیں بلکہ ادب برائے زندگی کا نظریہ اپنایا ہے۔ ان کو محض قافیہ پیمائی کا شوق نہیں بلکہ ان کی شاعری کی جڑیں لوگوں کے دلوں میں پیوست ہیں۔ (خدا کرے زور قلم اور زیادہ ہو)

☆☆☆☆☆☆☆☆

فرخندہ رضوی کی تخلیقات

سنوخموشی کی داستان

فرخندہ رضوی کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ جو جنوری 2002 میں شائع ہوا۔ یہ شعری مجموعہ آزاد اور نثری نظموں پر مشتمل ہے۔ جسے آئیڈیل پبلی کیشنز اردو بازار کراچی پاکستان نے شائع کیا اور جس کی کمپوزنگ کا فریضہ فیضان صابری کمپوزنگ سنٹر نے سرانجام دیا۔اس وقت کے مطابق اس شعری مجموعے کی پاکستانی قیمت 225 روپے اور برون ملک 8 امریکی ڈالرز تھی۔

اس کا انتساب فرخندہ رضوی نے اپنی جان سے پیاری دوست ثمینہ کے نام کیا۔ یہ شعری مجموعہ ایک سو آزاد اور نثری نظموں پر مشتمل ہے۔اس شعری کتابچہ میں انتساب کے اگلے صفحے پر اپنے خیالات کا اظہار فرخندہ رضوی نے اس کے بارے میں یوں کیا ہے۔''مجھ میں ایسا کچھ نہیں کہ مجھ سے ملا جائے اتنا کافی ہے کہ تحریروں کو ملاقات کا ذریعہ بنائیں''

بس جذبوں کی سچائی لفظوں میں سمیٹتی رہی ہوں۔ یہ راہیں یہ سفر پرانا ہے۔اپنی کاوشوں کو تحریری صورت میں مختلف میگزین میں بکھراتی رہی ہوں۔محبت کو جنون کا نام دیا ہے میں نے۔شعری ذوق کسی کا ورثہ نہیں۔ جو چاہے دل کی دھڑکنوں سے نکلی ہر سانس کو لفظوں میں بیان کر سکتا ہے۔

مجھ جیسی کم تعلیم یافتہ ہستی کا آسان لفظوں میں یہ سمجھا دینا کہ لہریں جوش سے مچلتی ہیں تو ساحل اور قریب چلا آتا ہے۔اپنی تمام تحریریں بہت محبت سے پیار سے پڑھنے والوں کے نام۔

(بہت پیار کرنے والے میرے جیون ساتھی کی اجازت سے) (فرخندہ رضوی)

"سنوخموشی کی داستان" کے حوالے سے عرض ناشر میں سلیم احمد یوں رقم طراز ہیں:

> "فرخندہ رضوی جو آج کے دور کی شاعرہ ہیں، ان کا کلام "سنو خموشی کی داستان" آزاد شاعری میں ایک نیا منفرد کلام ہے جو قارئین کو ضرور ضرور پسند آئے گا"(23)

فاصلے ستارہے ہیں

فاصلے ستارہے ہیں فرخندہ رضوی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو جنوری 2006ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ شعری مجموعہ بھی آزاد نظموں پر مشتمل ہے جسے یونائیٹڈ صابری پبلی کیشنز اردو بازار کراچی نے طبع کیا۔ اور جس کی کمپوزنگ بھی فیضان صابری کمپوزنگ سینٹر سے ہی ہوئی۔ قیمت 150 روپے پاکستانی اور برطانیہ میں 5 پونڈ تھی۔ اس کتاب کا انتساب فرخندہ رضوی نے اپنی زندگی کے ساتھی بشیر رضوی کے نام کر کے انکی محبتوں اور تعاون کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ یہ شعری مجموعہ بھی ایک سو آزاد نظموں پر محیط ہے۔ ''کچھ اپنے بارے میں'' میں فرخندہ رضوی کہتی ہیں۔

> "خداوند کریم کی شکر گزار ہوں کہ ایک موقع اور ملا اپنی دوسری کتاب مکمل کر پائی، اردو سے محبت تو ہمیشہ رہی۔ بہت عرصہ ہوا شاعروں کے اردگرد گھومتے۔۔۔۔۔ زیر نظر انتخاب میں کوئی ایسا دعوی تو پیش نہیں کر رہی۔۔۔۔ مگر اتنا ضرور کہوں کی دل کی کیفیت کو محسوس کیا جائے گا تو میں نے اپنی پہچان خود کرانے کی کوشش کی ہے"(24)

فرخندہ رضوی صاحبہ کی یہ تمام کوششیں دیار غیر (انگلینڈ) میں بیٹھ کر قابل رشک اور قابل ستائش ہیں۔ وہ اس مشینی ملک میں رہتی ہیں جہاں کا ہر انسان ایک مشین بن چکا ہے۔ مگر وہ باوجود اس کے انسان اور انسان دوستی کی علمبردار ہیں۔ اپنے دلی جذبات و احساسات کو گاہے بگاہے کتابوں میں زیور طباعت سے آراستہ کرتی ہیں۔ وہ ایک سچے جذبے کی متحرک شاعرہ ہیں۔ جو اپنے اردگرد کے ماحول کو بھی اپنی آزاد شاعری سے باخبر رکھتی ہیں۔ بقول شہزاد احمد

> "فرخندہ رضوی صاحبہ جدید، موثر اور تازہ و توانا لہجے کی شاعرہ ہیں۔۔۔ طبیعت کا زیادہ تر میلان آزاد شاعری کی جانب ہے جو سفر شاعری "سنو خموشی کی داستان" سے شروع کیا تھا وہ نہ صرف ہنوز جاری ہے۔ "فاصلے ستارہے ہیں" دوسرا معتبر حوالہ

ہے۔۔۔ میں نے محترمہ کے دو مجموعوں میں حمد و نعت کی کمی
محسوس کی ہے۔ مجھے امید ہے محترمہ اپنے تیسرے مجموعہ کلام
میں اس تشنگی "حمد و نعت" کو دور کریں گی "(25)

پھر وہ صبح کہاں

فرخندہ رضوی کا تیسرا افسانوی اور سچی کہانیوں پر مشتمل مجموعہ ہے۔ جو 2010 میں شائع ہوا۔ یہ فرخندہ رضوی نے شیریں کلام سخن کی بجائے نثر پر طبع آزمائی کی ہے۔ فرخندہ رضوی چونکہ سماج کی عکاس ہیں اور سماجی مسائل کو لوگوں کے سامنے لاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں ہونے والے چیدہ چیدہ مسائل کو افسانوں اور سچی کہانیوں کی صورت میں پیش کرنے کے فن سے بخوبی آگاہ ہیں۔ عورتوں کے حقوق، مردوں کے ظلم و ستم، عورت ہی عورت کی دشمن ہے، چاہے وہ سگی بہن ہی کیوں نہ ہو، پردیس کی مشکلات، معاشی ناہمواریاں، غربت و افلاس وغیرہ جیسے سماج میں ہونے والے سچے واقعات کو افسانوی رنگ میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ برطانیہ میں بطور افسانہ نگاران کا قلم تسلیم شدہ مانا جاتا ہے۔

زیرلب خندہ

فرخندہ رضوی کا چوتھا شعری مجموعہ " زیرلب خندہ" ہے۔ جو 2012 میں شائع ہوا۔ یہ شعری مجموعہ غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے جسے بزم تخلیق ادب پاکستان کراچی نے طبع کیا۔ جس کی کمپوزنگ فوکس کمپوزنگ سینٹر نے کی۔ اس کتاب کا انتساب اپنی والدہ محترمہ زبیدہ بٹ (مرحومہ) اور اپنی بہن امتل حمید بٹ (مرحومہ) کے نام ہے۔ اس شعری مجموعہ کی ترتیب میں دو حمد باری تعالی، ایک نعت، 55 غزلیات 32 نظمیں اور ایک قطعہ شامل کتاب ہے۔ بقول صفدر ہمدانی:

"فرخندہ رضوی کے اکثر شعر زیرلب مسکراہٹ کے ہیں اور یہی
وہ احساس کی سطح ہے جہاں زیرلب مسکرا بڑے قہقہے سے زیادہ
طاقت رکھتی ہے۔ میری دعا ہے فرخندہ رضوی کا یہ قلمی، فکری اور
فنّی سفر کسی سقم کے بغیر رواں دواں رہے "(26)

قلم خندہ

فرخندہ رضوی کا پانچواں مجموعہ " قلم خندہ" ہے۔ جو 2015 میں شائع ہوا۔ یہ کتاب تنقیدی مضامین، تجزیے، تبصرے، مضامین پذیرائی، سفر نامہ پر مشتمل ہے، جسے روزن پرنٹرز ادبی فورم گجرات پاکستان نے طبع کیا۔ فرخندہ رضوی نے اس کتاب کا انتساب اپنے پہلے استاد جناب خالد یوسف صاحب مرحوم اور قابل احترام ومحترم استاد صفدر ہمدانی صاحب کے نام کیا ہے۔

اس کتاب میں فرخندہ رضوی نے معروف شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات پر اپنے خیالات کا اظہار کر کے انہیں داد وتحسین پیش کیا ہے۔ حصہ اوّل میں معروف ادبی شخصیات پر فرخندہ رضوی کے تبصرے وخیالات ہیں اور حصہ دوم میں فرخندہ رضوی معروف ادبی شخصیت کی نظر میں، حصہ سوم سفر نامچہ پر مبنی ہے جو لندن سے سیالکوٹ براستہ دبئی سے متعلق ہے۔ فرخندہ رضوی قلم خندہ میری ایک اور کاوش کے ضمن میں رقمطراز ہیں

> " میری نوک قلم میں اتنا سلیقہ کہاں میں شکر گزار ہوں اپنے پروردگار کی جس نے مجھے یہ ہنر دیا۔ تمام تعریفیں اللہ تعالی کے لیے اور صلوۃ وسلام اللہ کے رسول پر۔۔۔۔ یہ میرا پانچواں مجموعہ ہے جو ان تمام مضامین پر مشتمل ہے جو میں نے بہت سے مرد وخواتین مصنفین کی کتابوں پر لکھے۔ اس پذیرائی سے میرا حوصلہ بڑھا اور میں نے اپنے قلم کی طاقت سے لفظوں کا سلسلہ اسی طرح جاری رکھا۔ میں لفظوں کے سمندر میں اپنا عکس دیکھتی اور اپنی ان سطور میں زندگی کا عکس بھرنے کی کوشش کرتی ہوں"(27)

خوشبوئے خندہ

فرخندہ رضوی کا چھٹا شعری مجموعہ "خوشبوئے خندہ" ہے۔ جو 2018ء میں شائع ہوا۔ یہ شعری مجموعہ نظموں، غزلوں اور قطعات پر مشتمل ہے۔ جسے فرخندہ رضوی نے خود کمپوز کیا ہے۔ ہر

گزرتے وقت کے ساتھ ان کا قلم وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔اس کتاب میں قلم کی جولانیوں نے دو حمد باری تعالیٰ، محبوب کبریا (نعت) رب ذوالجلال سے التجا و دعا، شاہ کربلا پر سلام، ماہ محرم جیسے سماجی موضوعات پر لکھ کر شاعرات میں اپنا لوہا منوالیا ہے۔اس شعری مجموعے کو 127 غزلیات اور نظموں سے آراستہ کر کے ایک اعلی پایہ کی شاعرہ کا اعزاز حاصل کیا ہے۔

اس کا انتساب فرخندہ رضوی نے اپنے والد محترم عبدالرشید بٹ (جن کی محبت و تربیت نے مجھے اچھا انسان رشتوں کے تقدس کا احترام سکھایا) کے نام کیا۔بقول ڈاکٹر مقصود جعفری:

> ''زیر نظر مجموعہ'' خوشبوئے خندہ''ان کی تازہ غزلیات اور منظومات اور آزاد نظموں پر مبنی ہے۔غزلیات میں سلاست و بلاغت ہے۔احساس کی شدت اور شعور کی جدت ہویدا ہے۔نظم ''خالی ہاتھ'' میں وہ دلدار سے فقط ایک پھول کے تحفے کی خواستگار ہیں، عصر جدید کی محبوبائیں اور بیویاں ''پھول''نہیں بلکہ زر و مال کی طلب گار ہیں جبکہ نیک دل و نیک خصلت شاعرہ اس پرخار زندگی میں ایک تازہ و خوشبودار پھول کی خواہاں ہے۔ پھول یہاں وفاداری اور قناعت کا ابدی استعارہ ہے۔جو خندہ کا اسلوبی استعارہ ہے''(28)

خوشبوئے خندہ میں فرخندہ رضوی کے ادبی کالم، ان کی اردو ادب سے محبت، بطور شاعرہ اور ادیبہ کی حیثیت سے ان کو خلوص و احترام کے ساتھ نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے ساحر شیلوی (لیوٹن) لکھتے ہیں:

اردو کی خدمت گار فرخندہ رضوی
جیون میں پر بہار فرخندہ رضوی
اردو ادب جس کی آغوش میں پلتا ہے
ہے حق پرست روادار فرخندہ رضوی
نہیں فقط شاعرہ اعلیٰ اور دل کش

اک افسانہ نگار فرخندہ رضوی
غم نہیں اردو کو جب تک ہے یہ ساتھ
اردو کی دستار فرخندہ رضوی
اردو سے جس کو عشق اردو پہ جو نثار
ہم سب کی دلدار فرخندہ رضوی
دعائے ساحر شیلوی ہے آخری دم تک
رہے اردو پے بلہار فرخندہ رضوی (29)

تخلیق خندہ

فرخندہ رضوی کا ساتواں مجموعہ " تخلیق خندہ" ہے۔ جو نمود اول 2021 میں شائع ہوا۔ یہ کتاب مضامین، تبصرے، تجزیے اور طنز و مزاح پر مشتمل ہے۔ جسے شہریار ناصر نے کمپوز کیا ہے اور دور حاضر میں اس کی پاکستانی قیمت 500 روپے (30 یورو 40 ڈالر) قرار پائی ہے۔ اس کتاب کا انتساب فرخندہ رضوی نے اپنے پیارے داماد اور اپنے پیارے نواسے، پیاری نواسی کی محبتوں کے نام سے کیا ہے۔ یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے جس میں فرخندہ نے نہ صرف دوسروں پر تبصرے کیے ہیں بلکہ فرخندہ رضوی پر بھی ناقدین کی آراء قلمبند ہوئی ہیں۔ علاوہ ازیں طنز و مزاح پر مبنی مضامین بھی اپنی گلکاریاں بکھراتے نظر آتے ہیں۔

زیر نظر کتاب میں حافظ صفوان فرخندہ رضوی کی شاعری کی چار خصوصیات کا اظہار بڑے برملا انداز سے کرتے ہیں۔ ان کے مطابق فرخندہ کی شاعری جستہ جستہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ جس میں چار چیزیں بالکل سامنے ہیں۔

یہ موضوعات روایتی شاعری والے ہیں روایتی سے مراد روح عصر سے مربوط ہونا نہ کہ کلاسیکی روایت۔ چنانچہ وہ نظم کم ہی کہتی ہیں لیکن ان کی غزلیں موضوعاتی ہوتی ہیں۔ غزل میں یہ چلن آج سے نہیں دلی کے اجڑنے کے بعد ہونے والی غزلیہ شاعری سے متواتر چلتا رہا ہے۔ فرخندہ رضوی اس روایت کی شاعرہ ہیں چنانچہ ان کی شاعری کے موضوعات بھی وہی ہیں۔ جو آج

کے سماج سے براہ راست مربوط ہیں۔ اقدار، انسانیت، برابری وغیرہ تاہم ان کو جو چیز معاصر خواتین شعراء سے ممتاز کرتی ہے، وہ ان کے ہاں تانیثیت اور فیمینزم کی سستی دوکانداری نہ ہونا ہے۔ فرخندہ کی شاعری کسی بھی پاپولر نعرے کے پیچھے چلتی نظر نہیں آتی۔

دوسری چیز ان کی شاعری میں ہیئت کے تجربات نہ ہونا ہیں۔ ہیئت کے تجربے شوق میں یا کسی خاص کیفیت وضرورت کے تحت کیے جاتے ہیں۔ فرخندہ کو غالبا ایسی کسی صورتحال کا سامنا نہیں ہوا۔ مغرب میں رہنے کے باوجود سانیٹ یا ہائیکو قسم کی چیز ان کے ہاں نہیں ہے وہ شعر کے مروجہ سانچے پر بالکل مطمئن ہیں۔

فرخندہ کی شاعری کی تیسری ممتاز چیز ان کے ہاں لفظوں کا قرار واقعی معنی میں استعمال ہونا ہے۔ ان کے ہاں شاعری پائی جاتی ہے نہ کہ کلام مصنوع۔ چنانچہ لفظوں سے کھیلنے، محاوروں کی پنسر یاں لڑھکانے اور مگس کو باغ میں جانے دیجو قسم کے ابہام بھری استعاری زبان ان کے ہاں بالکل نہیں ہے۔

چوتھی چیز وہ ہے جو فرخندہ کی شاعری میں تلاش کرنے کی ہر کوشش ناکام ہوتی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ کسی شاعر کی لفظیات یا رنگ۔ جہاں شاعرات سے یہ پوچھا جاتا ہو کہ آپ کا پہلا مجموعہ کس شاعر پر گیا ہے۔ اور دوسرا اور تیسرا کس پر گیا ہے اور چوتھا کس پر جائے گا۔ وہاں ایک شاعرہ ایسی ہے جس کی شاعری کا دورانیہ دو عشروں پر محیط ہے۔ لیکن اس پر نہ پروین شاکر کی چھوٹ پڑتی دکھتی ہے نہ فہمیدہ ریاض کی اور نہ کسی مرد شاعر کی۔ تو ایسی شاعرہ کو ٹھہر کر پڑھنا پڑتا ہے۔ یہ دعوی بڑی ذمہ داری کا ہے اور میں پورے اطمینان کے بعد یہ دعوی کر رہا ہوں۔

آخر میں ذکر اس دوسری چیز کا جو فرخندہ کی شاعری میں تلاش کرنے میں ناکامی ہوتی ہے وہ بھاشن دہی اور سستی جذباتیت۔ فرخندہ کی شاعری میں اس قسم کی چیزیں نہیں ہیں۔

جناب حافظ صفوان کے اس تبصرے کے بعد یہ طے ہوا کہ فرخندہ رضوی واقعی لاجواب شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔ جن کی خصوصیات کا ذکر کا ہے بگا ہے ادبی شخصیات کی طرف سے ہوتا رہتا ہے۔ بقول سید انور ظہیر رہبر

"آپ کا تعلق ایک ادبی گھرانے سے نہ ہونے کے باوجود آپ
کی اردو ادب سے محبت نے ادب کے ذوق کو جلا بخشی جو کہ اردو

ادب کی ترویج کے لیے مبارک ثابت ہوئی۔ ''تخلیق خندہ'' آپ
کے ان کالموں پر مشتمل ہے جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔
یہ آپ کے ساتھ بھی کتاب ہے جو آپ کی ادب دلچسپی کی غماز
ہے۔ آپ اسم بامسمی ہیں بہت کم ایسی شخصیات ہوتی ہیں جن
کے نام ان کی زندگی کے بھرپور عکس ہوتے ہیں۔ فرخندہ رضوی
بھی اُن خوش نصیبوں میں سے ہیں۔۔۔۔۔۔ آپ نہ صرف
اردو ادب کے لیے کوشاں ہیں بلکہ انسانیت کے جذبے سے بھی
معمور ہیں'' (30)

فرخندہ رضوی کو اردو کی آبیاری اور ادبی خدمات کے صلے میں مختلف تنظیموں کی طرف سے ایوارڈز اور سرٹیفکیٹ سے نوازا گیا

☆ جرمنی اردو انجمن (برلن) نے ان کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے سرٹیفکیٹ دیا
☆ پاکستانی کمیونٹی سنٹر ریڈنگ (برطانیہ) نے ریڈنگ میئر ایوارڈ سے کئی بار نوازا۔
☆ پاکستان میں الفانوس ادبی تنظیم نے ادبی خدمات پر ایوارڈ سے نوازا۔

فرخندہ رضوی کی تصانیف کی تفصیل

☆ پہلا شعری مجموعہ ''سنو خاموشی کی داستان'' آزاد اور نثری نظموں پر مشتمل، جنوری 2002ء
☆ دوسرا شعری مجموعہ "فاصلے ستارے ہیں" نظموں پر مشتمل، 2006ء
☆ تیسرا مجموعہ "پھر وہ صبح کہاں" افسانوں اور سچی کہانیوں پر مشتمل 2010,ء
☆ چوتھا شعری مجموعہ "زیر لب خندہ" 2012ء
☆ پانچواں مجموعہ "قلم خندہ" مضامین اور تجزیے 2016,ء
☆ چھٹا شعری مجموعہ "خوشبو؟ خندہ" 2019ء
☆ ساتواں مجموعہ "تخلیق خندہ" 2021ء
☆ کالم، مضامین، سفرنامہ، تجزیے اور طنز و مزاح پر مشتمل ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1 پروفیسر محمود الحسن شاکر، خوشبوئے خندہ، بزم تخلیق ادب پاکستان، کراچی، 6 مئی 2018، ص:18

2 ضیاء شہزاد، اظہار رائے، خوشبوئے خندہ، ص:26

3 امجد مرزا امجد، تخلیق خندہ، اردو سخن پاکستان، اردو بازار چوک اعظم لیہ، 2021، ص:120

4 فرخندہ رضوی، زیر لب، بزم تخلیق ادب پاکستان، کراچی، 2012ء، ص:201

5 فرحت عباس شاہ، زیر لب خندہ، ص:17

6 ایضاً، ص:211

7 فرخندہ رضوی، رابطہ ٹیلی فونک، 5 اگست 2021ء بوقت پاکستان، شام 5:00 بجے بروز جمعرات

8 ناصر کاظمی، انتخاب انشاء، فضل حق اینڈ سنز پبلشرز اینڈ پرنٹرز دربار مارکیٹ لاہور، دسمبر 1991ء، ص72

9 مرزا غالب اردو کی ضرب المثال اشعار (تحقیق کی روشنی میں) مرتب شمس الحق

10 فرخندہ رضوی، زیر لب خندہ، ص:180

11 ایضا، ص:201

12 منور احمد کنڈے (انگلینڈ)، فاصلے ستارے ہیں، یونائیٹڈ صابری پبلی کیشنز اردو بازار کراچی، جنوری 2006ء، ص:6

13 فرخندہ رضوی، خوشبوئے خندہ، پیش لفظ، ص 12 تا 14

14 ایضاً، ص 11 تا 12

15 بانو ارشد، زیر لب خندہ، 2012ء، ص:23

16 رابطہ ٹیلیفونک، 15 اگست 2021، 7:00 بجے شام، پاکستان وقت، بروزِ اتوار

17 ایضاً، 20 اگست 2021ء، 6:00 بجے شام، بروز جمع؟ المبارک

18 فرخندہ رضوی، خوشبوئے خندہ، ص:72

19 محمد اشفاق ایاز، قلم خندہ، ورلڈ پنجابی فورم، پاکستان، اوزن پرنٹرز، گجرات، 2015ء، ص:12

20 فرخندہ رضوی، خوشبوئے خندہ، ص:63

21 فرخندہ رضوی، تخلیق خندہ، ص:76

22 فرخندہ رضوی، قلم خندہ، ص:210

23 فرخندہ رضوی، سنو خموشی کی داستان، ص:1

24 فرخندہ رضوی، فاصلے ستارے ہیں، کچھ اپنے بارے میں، جنوری 2006ء، ص:1

25 شہزاد احمد، فاصلے ستارے ہیں، ص:8

26 صفدر ہمدانی، زیر لب خندہ، ص:13

27 فرخندہ رضوی، قلم خندہ، ص:9

28 ڈاکٹر مقصود جعفری، نیویارک، خوشبوئے خندہ، اپریل 2008ء، ص:22

29 ساحر شیلوی، لیوٹن، خوشبوئے خندہ، ص:25

30 سید انور ظہیر رہبر، تخلیق خندہ، نمود اول، 2021ء، ص:17

☆☆☆☆☆☆☆

سماج اور سماج فہمی

سماج

سماج لفظ سنسکرت زبان کے دو لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ "سم" اور "آج" سم کے معنی ہیں اکٹھا یا ایک ساتھ اور آج کے معنی ہیں رہنا۔ یعنی سماج کے لغوی معنی ہیں ایک ساتھ رہنا۔ اس خیال سے جہاں افراد ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں وہیں سماج بن جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں معاشرے کے لئے سوسائٹی (society) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ عمرانیات میں افراد کے باہمی تانے بانے کو معاشرہ کہتے ہیں۔ عموماً معاشرے سے مراد افراد کا گروہ لیا جاتا ہے۔

''لفظ سماج کے لغوی معنی معاشرہ سوسائٹی ،انجم، حلقہ، ٹولہ، یا
صف کے ہیں اور یہ سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔''(1)

عام فہم الفاظ میں تو تمام انسانوں ہی کا مجموعہ سماج کہلاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی یہ سوال اٹھانا شروع کر دے کہ انسان کیا ہے؟ تو پھر انسان اور سماج دونوں کے وجود پر سوال اٹھنا شروع ہو جاتے ہیں اور دونوں ہی پیچیدہ تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ انسان صرف گوشت پوست کا لوتھڑا تو نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا صاحب شعور اور صاحب نطق جانور ہے جو صرف ایک وجود نما نہیں ہے۔ بلکہ اس وجود کی بقا کے لئے تمام مادی، جغرافیائی اور مالیاتی نظام کا نام بھی ہے۔

اس تعریف کے مطابق کوئی انسان اس وقت تک مکمل انسان کہلا ہی نہیں سکتا جب تک اسے اپنی بقا کے لئے تمام تر "معیاری" اور "مناسب ماحول" حاصل نہیں ہو جاتا۔ اب معیاری اور مناسب ماحول کیا ہوتا ہے؟ کیونکہ فطرت نے ہمیں اپنے جینے کے لئے کوئی نہ کوئی معیاری اور مناسب ماحول فراہم نہیں کیا۔ اس کے لئے انسان نے خود تگ و دو کی ہے۔ اس لیے یہ اضافی صفات بن گئی ہیں۔

گروہ اور اجتماع اپنی سادہ شکل سے پیچیدہ شکل کی طرف سفر کرتے رہے ہیں، اس لئے یہ "مناسب" اور "معیاری" رقابلی صفات بھی ہوتی گئیں۔ لوگوں کے تمام گروہ اور اجتماع کے

ارتقائی مراحل سے گزرنے کے عمل کے دوران اور سماج کے موجودہ شکل تک سفر کے مراحل طے کرتے ہوئے یہ دونوں اصطلاحات اچھی خاصی "سیاسی" اصطلاحات بن گئیں۔

سماج کی تعریف صرف یہاں پر ہی ختم نہیں ہوتی۔ جدید سماج نے انسان کی مادی اور شعوری ترقی کے درمیان اور روز بروز پیچیدہ صورتحال کو جنم دے دیا ہے۔ جو قدیم سماجوں میں اتنی پیچیدہ نہیں تھیں۔ اس معیاری اور مناسب ماحول کے افراد کی انفرادی زندگی میں کچھ معنی ہوتے ہیں اور پورے سماج کی اجتماعی زندگی میں بھی "معیاری" اور "مناسب" اپنے معنی رکھتے ہیں۔

پہلے بات جدید فرد کی تعریف سے شروع کریں تو دور جدید کا انسان ایک ایسا انسان ہے جو موجودہ دور کے تمام تر مناسب ماحول اور انسانی علم و آگہی اور سائنس نے اس میں جو بھی بہتری پیدا کی ہے، اس کو اپنا ماحول خیال کرتے ہوئے، اس کے لئے جدوجہد کرنے والا عامل ہے۔ لیکن جب اسے ''مناسب'' اور ''معیاری'' ماحول حاصل نہیں ہوتا، تو وہ اپنے حالات، گردونواح اور ماحول کا جائزہ لیتا ہے اور اپنے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کہ آخر وہ کونسے عوامل ہیں جو اس ماحول کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

اپنے اس سوال کے جواب میں وہ سماج کے مختلف گروہوں، انفرادی سطح پر اس سمت میں کوشش کرنے والے افراد کی کوششوں اور حتیٰ کہ ریاستی ادارے کے کردار کا جائزہ لیتا ہے تو وہ پریشان ہو جاتا ہے اور اسے ہر کوئی اپنی راہ کی رکاوٹ لگتا ہے۔ اسے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ سارا ماحول انسان کا پیدا کردہ ہے لیکن اس میں اسے اپنے لئے کوئی گنجائش نظر نہیں آتی بلکہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ انسانوں میں سے چند ایک ہی اس پر قابض ہیں۔ اور صرف وہی ان آزمائشوں کے حصول کو اپنا زیادہ حق سمجھتے ہیں اور وہ اس ماحول پر اس کے حق کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ جونہی یہ شعور اس کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ تو اس وقت فرد ایک انسان نہیں رہتا بلکہ دو ہو جاتا ہے۔

یعنی ایک وہ فرد جو عام طور پر عملی زندگی میں اپنی مادی ضروریات اور مناسب اور معیاری ماحول کی تگ و دو میں پھر رہا ہے اور دوسرا اس کے اندر خیالی انسان ہوتا ہے جو اس کے اندر رہنے کے باوجود باہر آنے کی آزادیوں سے محروم ہوتا ہے۔ وہ آزاد ہونے کے باوجود ایک کرب اور بے بسی کا شکار رہتا ہے۔

اس مرحلے پر انسان کی ایک سطح پر اپنے آپ سے بھی ایک کشمکش شروع ہو جاتی ہے، تو دوسری سطح پر اپنے سماج، اپنی ریاست اور ریاستی مشینری کے ساتھ بھی ایک جنگ جاری رہتی ہے یعنی باہر کجا مادی انسان جو جتنا مادی ماحول اسے نصیب ہوتا ہے۔ اس میں زندگی بسر کرنے کے لئے بضد ہوتا ہے جبکہ اس کے اندر کا انسان وہی مناسب یا معیاری (جو اس کے لیے "مثالی" ماحول ہوتا ہے) کو تلاش کرنے یا پھر اس طرح کا کوئی اور نیا ماحول تراشنے کی تگ ودو میں رہتا ہے۔

اس طرح حقیقی مادی انسان اور اس کے اندر موجود رہنے والے تصوراتی اور خیالاتی انسان کے درمیان مسلسل جنگ رہتی ہے۔ تصوراتی اشخاص کی مختلف اقسام ہوسکتی ہیں، ایک قسم تو سادہ لوگوں کی ہوسکتی ہے جو اپنے تصورات میں فرد، سماج، ریاست اور ریاستی مشینری کے جیسے ہیں اور جہاں ہے کی بنیاد پر قبول کر لیتے ہیں اور صرف اپنی تمام تر صلاحیتوں کو اس میں ایڈجسٹ ہونے کے لئے صرف کرتے ہیں۔ عمومی طور پر افراد کا یہ گروہ مڈل کلاس کے لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ دوسری قسم علمی اور فکری سطح پر کاوش کرنے والے لوگوں کی ہے۔ اگرچہ ان افراد کو بھی مختلف اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے لیکن یہاں ہم ایک محدود دائرے میں ذہنی توجہ ان افراد کے جم غفیر میں صرف خودشناسی اور خودآگہی کے متلاشی افراد پر مرکوز کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اس مرحلے پر خودشناسی کے عمل سے گزرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ انہیں یہ آگاہی ہونا شروع ہو جاتی ہے کہ انسان حقیقت میں کیا ہے اور کیا نہیں ہے جہاں تک " کیا ہے۔" کا سوال ہے۔ تو وہ اپنی سرشت میں " کیا نہیں ہے " سے بہت زیادہ محدود ہے۔

"انسان کیا ہے؟" جیسے سوال کے جواب کے لیے وہ صرف اور موجودات اور وجودات سے متعلق رہتا ہے۔ اس کے برعکس " کیا نہیں ہے " کے حوالے سے اس کے پاس وسیع تر امکانات کی دنیائیں ہوتی ہیں کیونکہ اسی " کیا نہیں ہے؟" میں اس کے خیالی اور تصوراتی انسان کی دنیائیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ اس کی ان دنیاؤں کی وسعت کا انحصار بھی اس کے علم، تجربے اور مشاہدات کے تابع ہوتا ہے۔ جتنا اس کا تجربہ اور مشاہدہ وسیع ہوگا۔ اتنا ہی اس کی خیالی اور تصوراتی دنیا وسیع ہوگی۔

اسی " کیا نہیں ہے؟" والے سوال سے نبرد آزما ہونے والا انسان دراصل تصوراتی اور خیالاتی انسان ہوتا ہے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ایسے افراد کی اس قسم کی شخصیت سازی کے

اصل محرکات یہی سماج (society) اور خود اس کا ماحول ہوتا ہے۔ جو انہیں ردعمل کی طور پر اس فکری عمل کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس حوالے سے تمام تر فکری عمل مادے کے عمل اور اس کے ردعمل کے امکانات کی دنیا ہوتا ہے۔ ایسے افراد سماج ہیں۔ اس کی ان دنیاؤں کی وسعت کا انحصار بھی اسی عمر، تجربے اور مشاہدات کے تابع ہوتا ہے۔ جتنا اس کا تجربہ اور مشاہدہ وسیع ہوگا اتنا ہی اس کی خیالی اور تصوراتی دنیا وسیع ہوگی۔

اسی " کیا نہیں ہے؟" والے سوال سے نبرد آزما ہونے والا انسان دراصل تصوراتی اور خیالاتی ہوتا ہے۔ یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ایسے افراد کی اس قسم کی شخصیت سازی کے اصل محرکات یہی سماج اور خود اس کا ماحول ہوتا ہے۔ جو انہیں ردعمل کے طور پر اس فکری عمل مادے کے عمل اور اس کے ردعمل کے طور پر امکانات کی دنیا ہوتا ہے۔ ایسے افراد سماج میں رہتے ہوئے بھی اپنی شناخت اور خود آگہی کے متلاشی ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے مختلف سماج ترقی کے مختلف مدارج پر ہوتے ہیں تمام سماجوں کی ترقی یکساں نہیں ہوتی ہے۔

معاشرہ افراد کا ایسا گروہ ہے۔ جس میں ایک دوسرے کے ساتھ لگاؤ اور تعاون کی فضا قائم ہو جہاں مشترک ثقافت مشترک اشتراک عمل کے کسی طے شدہ ضابطے اور قانون و اصول کے مطابق زندگی گزار رہے ہوں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک فرد کا دوسرے فرد سے تعلق کے بغیر رہنا مشکل ہی نہیں محال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افراد ایک دوسرے کے ساتھ تعلق کی بنا پر زندگی کی دوڑ میں مصروف نظر آتے ہیں اور اسی طرح گروہی زندگی قائم و دائم ہے۔ مگر جانوروں میں یہ شعوری کوشش نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ ارسطو نے انسان کو سماجی جانور قرار دیا ہے۔ معاشرہ ہی انسان کو انسان کے رتبے پر لاتا ہے۔ وگرنہ معاشرے کے باہر وہ حیوان ہی ہے۔ معاشرہ یا سماج کے قیام و بقا میں کچھ عناصر کارفرما ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر سماج بنتا، قائم و دائم رہتا اور ترقی کرتا ہے۔

سماج یا معاشرہ کو قائم رکھنے میں اہم کردار یکسانیت کا ہے۔ یکسانیت کے بغیر سماج یا معاشرہ کا قائم رہنا ناممکنات میں سے ہے۔ لباس، زبان، خیالات، اقدار، عادات، رسومات، احساسات و جذبات اور عقائد میں یکسانیت وہ بنیادی عناصر ہیں جو لوگوں کو ایک ڈوری سے باندھے رکھتے ہیں یہ عناصر یا اجزا ہی لوگوں کے گروہ بندی کے لئے معاون و مددگار بنتے ہیں اور زندگی کی لذتوں سے

لطف اندوز ہوتے ہیں اس لحاظ سے رسوم و رواج اور عقائد وغیرہ میں یکسانیت معاشرے کی پائیداری اور استحکام کا سبب بنتے ہیں مگر ایسا کوئی پیمانہ، ضابطی یا طریقہ کار وضع نہیں ہوا جس سے معاشرتی تعلق کو جانچا، ماپا یا پرکھا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرتی تعلق کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ لوگوں کے گروہ، تنظیمیں اور اداروں کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ جو دراصل سماج کی جان ہیں۔ کوئی بھی سماج راتوں رات تشکیل نہیں پاتا اور نہ ہی یہ لوگوں کا عارضی گروہ ہوتا ہے جو ہجوم کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

سماج کے بننے میں سینکڑوں سالوں کی روایات اور اقدار کے ساتھ مل جل کر رہنے والے لوگوں اور گروہوں کی تنظیم ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ سماج میں بعض معاملات میں اختلافات بھی پائے جاتے ہیں اگر سماج صرف یکسانیت پر قائم رہے تو زندگی جام ہو کر رہ جائے گی۔ نہ کوئی ترقی اور نہ ہی کوئی تبدیلی وقوع پذیر ہوگی۔ اس طرح لوگوں کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ کسی بھی معاشرے یا سماج میں رہنے والے افراد میں مذہبی، سماجی، سیاسی، نسلی، لسانی اور معاشی اختلافات پائے جاتے ہیں یہی اختلافات سماج میں لوگوں کے نئے گروہوں کے وجود میں آنے کا سبب بنتے ہیں۔ پھر سماجی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ ان تمام اختلافات کے باوجود سماج کے لوگوں کو ایک دوسرے پر انحصار بھی کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ اکیلا فرد یا انسان اپنی ضروریات کی تکمیل کو پورا نہیں کر سکتا۔ اس لئے اسے دوسرے افراد اور گروہوں کا مرہون منت ہونا پڑتا ہے۔ یہ سب کچھ امداد باہمی کے زمرے میں آتا ہے اور یہ سماج کی ایک خاص خوبی اور وصف بھی شمار ہوتا ہے۔ سماج میں لوگ پیدا ہوتے ہیں، زندگی گزارتے ہیں اور زندگی گزار کر مر بھی جاتے ہیں۔ ان کا یہ جینا مرنا اکیلے پن کا نہیں تھا بلکہ دوسروں کی مدد اور تعاون کا مرہون منت تھا۔ انہی سماجی رویوں کے بل بوتے پر سماج تشکیل پاتا ہے۔

سماج/معاشرے کی اقسام

ماہرین عمرانیات نے معاشرے کو مندرجہ ذیل اقسام میں تقسیم کیا ہے۔

1- دیہی معاشرہ 2- بلدیاتی معاشرہ

3- خانہ بدوش معاشرہ 4- اقامتی معاشرہ

5- روایتی معاشرہ 6- جدید معاشرہ

1۔ دیہی معاشرہ:

دیہاتی لوگ دیہات میں رہائش پذیر ہوتے ہیں ایسے لوگوں کو دیہی سماج کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ کاشت کار جو اپنی زمینوں پر ہی گھر بنا کر رہائش اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ بھی دیہاتی معاشرے کا ہی حصہ تصور ہوتے ہیں۔ ہر معاشرہ اپنی بعض منفرد خصوصیات کی بنا پر خاص اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ دیہاتی معاشرہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔

دیہات میں لوگ کھلے اور بڑے گھروں میں رہتے ہیں بڑے بڑے صحن اور کچے مکان ہوتے ہیں مگر اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو شعور کی آگہی سے پکے مکان بنانے کا سلیقہ آ گیا ہے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ یہ رواج (Trend) عام ہوتا جا رہا ہے۔ دیہی معاشرے میں لوگوں کا روزگار زراعت پر مشتمل ہوتا ہے۔ جو لوگ کاشتکاری نہیں کرتے وہ بھی کاشتکاروں کے معاون کے طور پر کام کرتے ہیں جیسے لوہار، کمہار وغیرہ وغیرہ۔ البتہ بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ گاؤں کے پیشوں میں تبدیلی آ رہی ہے۔ اور لوگ پڑھنا لکھنا سیکھ کر ملازمت اور کاروبار کی جانب مائل ہو رہے ہیں۔ دیہی سماج میں غیر رسمی گروہ عام پائے جاتے ہیں۔ جیسے حقے کے اردگرد بیٹھ کر گپ شپ کرنے والے لوگ، پنچایت میں بیٹھے افراد یا آڑھتی کی دکان پر اکٹھے ہونے والے افراد وغیرہ۔ اس معاشرے کی ایک بہت اہم و خاص خوبی یہ ہے کہ یہ لوگ دکھ درد میں ایک دوسرے کا بھرپور ساتھ دیتے ہیں، دوسروں کی خوشی اور غم کو اپنا سمجھ کر حل کرتے ہیں مگر تعلیم کی کمی کے باعث یہی لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں کو انا کا مسئلہ بنا کر قتل و غارت تک نوبت لے جاتے ہیں اور کئی گھر تباہ و برباد ہو جاتے ہیں اور یہ دشمنیاں نسل در نسل چلتی ہیں۔

دیہی معاشرے میں تعلیم کا معیار بہت پست ہوتا ہے۔ زیادہ تر لوگ ان پڑھ ہوتے ہیں اور جو پڑھے لکھے ہوں وہ بھی واجبی تعلیم سے آراستہ ہوتے ہیں۔ دیہی علاقوں میں سکول پرائمری تک ہوتے ہیں اور مڈل اور ہائی سکول دور ہونے کی وجہ سے عموماً لوگ بچوں کو سکول نہیں بھیجتے یا کام پر لگا

لیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ لوگوں کی بڑی تعداد آبائی پیشوں سے وابستہ ہوتی ہے۔موچی کا بیٹا موچی،لوہار کا بیٹا لوہار اور مزارع کا بیٹا مزارع بن کر زندگی گزار دیتا ہے۔

دیہی معاشرے میں لوگ نہایت سادہ زندگی گزارتے ہیں۔سادہ روٹی، دودھ،لسی وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں اور سادہ کپڑے پہنتے ہیں۔لیکن کچھ مواقع پر فضول رسموں پر بے تحاشہ پیسے لگانے سے نہیں چوکتے جیسے فوتگی کی صورت میں قل، چالیسواں اور سالانہ ختم اور شادی بیاہ کے موقع پر ولیمہ کا کھانا اور جہیز وغیرہ کے معاملات۔بے شک ان رسومات کی ادائیگی کرتے ہوئے قرض سر پر چڑھ جائے یا کچھ گروی رکھنا پڑ جائے اور اس قرض کو اتارتے قبروں میں چلے جائیں۔

2۔بلدیاتی معاشرہ:

بلدیاتی معاشرہ کو اگر دیہی معاشرے کی ترقی یافتہ شکل کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔بلدیاتی سماج یا معاشرہ کی آبادی زیادہ ہوتی ہے۔گھر ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں اکثر مکان پکی اینٹوں سے بنے ہوتے ہیں جہاں بجلی، پانی وگیس اور ٹیلی فون کی سہولتیں میسر ہوتی ہیں۔

اس معاشرے میں معاشرتی زندگی کی تقریباً تمام سہولیات جن میں تعلیمی، سیاسی، مذہبی اور معاشرتی ادارے وغیرہ میسر ہوتی ہیں بلدیاتی معاشرے کے لوگ کام سے کام رکھتے ہیں اور بلا ضرورت کسی سے نہیں ملتے یا بہت کم ملتے ہیں۔لوگوں کی گروہی زندگی بھی رسمی ہوتی ہے جو کلب، تنظیم یا سوسائٹی تک محدود رہتی ہے۔ان لوگوں کے زیادہ تر پیشے کاروبار، تجارت، صنعتی پیداوار، سرکاری ونیم سرکاری ملازمت اور مزدوری وغیرہ ہیں۔

اکثر لوگوں کا معیار زندگی بہتر ہوتا ہے۔تاہم ادنیٰ درجے کی ملازمت یا کاروبار سے وابستہ کو اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔دیہی طبقہ کی نقل مکانی کے سبب رہائش کی قلت ہو جاتی ہے۔اکثر لوگ کرائے کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ترقی کے بڑے بڑے ادارے اس معاشرے میں موجود ہوتے ہیں۔جن میں بڑے کالج، یونیورسٹیاں، منڈیاں، ہوائی اڈے، ریلوے اسٹیشن اور ہسپتال وغیرہ شامل ہیں۔

تعلیم یافتہ اور ترقی پسند ہونے کی وجہ سے بلدیاتی معاشرہ کے افراد معاشرتی تغیر کی نئی

سکیموں کو جلدی جلدی اپنانے کی کوشش کرتے ہیں ٹیلی فون ، انٹرنیٹ ، موٹر گاڑیوں اور ہوائی جہازوں سے مستفید ہو کر یہ لوگ دنوں کا کام گھنٹوں میں اور گھنٹوں کا کام منٹوں میں کرتے ہیں۔اعلیٰ افراد کے لیے جدید طرز رہائش پر مبنی پلاٹس والی کالونیاں اور متوسط طبقہ کے لیے درمیانی درجہ کی سکیمیں ہوتی ہیں۔جبکہ اس سے بھی کم درجہ کے لوگ تنگ گلیوں اور کم سہولتوں والی آبادیوں میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔لوگ قدیم روایات کی بجائے جدت پسند ہوتے ہیں اور نئی اقدار کو جلد ہی قبول کر لیتے ہیں جن میں جدید ماڈرن قسم کے پہناوے،لباسوں کے نت نئے ڈیزائن ، سلائی کڑھائی کا نیا فیشن اور بناؤ سنگھار کی نئی مصنوعات شامل ہیں۔بلدیاتی سماج میں رہنے والے لوگ شادی بیاہ کے معاملے میں ذات برادری کی قدیم روایات کی شدت سے پابندی نہیں کرتے بلکہ جہاں مناسب رشتہ ملے وہاں شادی کر دی جاتی ہے۔

3۔خانہ بدوش معاشرہ:

اس سماج کے لوگ مستقل بنیادوں پر اپنی رہائش نہیں رکھتے بلکہ جہاں بنیادی ضروریات خوراک ، پانی اور مویشیوں کے لیے چارہ وغیرہ کی فراوانی ہو وہیں ڈیرہ ڈال کر رہنا شروع کر دیتے ہیں۔یہ جگہ بدلتے رہتے ہیں یہ عام طور پر قبیلے کی شکل میں ہوتے ہیں۔اس سماج کے لوگوں میں یگانگت ، باہمی ہمدردی ، ایثار و محبت کے گہرے جذبات پائے جاتے ہیں۔یہ چھوٹا سا معاشرہ ہوتا ہے جس میں افراد کی تعداد عموماً چند سو نفوس پر مشتمل ہوتی ہے۔

خانہ بدوش لوگوں کی غیر منقولہ جائیداد نہیں ہوتی اس لئے ان میں وراثت کا مسئلہ نہیں بنتا ہے اور نہ ہی ان میں زمین و جائیداد کے تنازعات جنم لیتے ہیں۔خانہ بدوش لوگ شادی بیاہ اپنے قبیلے سے باہر نہیں کرتے۔بلکہ آپس میں ہی رشتے طے کر لیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ مضبوط سماجی بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔اس معاشرے میں تغیر نہ ہونے کے برابر ہے۔لوگ ایک ہی روایت پر چلتے ہیں آباؤاجداد کی روایات کے ساتھ ساتھ جیتے اور مرتے ہیں ان لوگوں کا عام پیشہ بھیڑ بکریاں ، اونٹ ، خچر ، گھوڑے اور گدھے پالنا ہے۔عموماً خانہ بدوش مرد گھروں میں آرام کرتے اور اپنی عورتوں اور بچوں کو بھیک مانگنے کے لئے باہر بھیج دیتے ہیں۔ایسے عزت دار مردوں کو اس چیز

کی بھی فکر نہیں ہوتی کہ وہ روٹی اور پیسہ کیسے لے کر آتی ہیں؟"ہاتھ پھیلا کر یا عزت بیچ کر"۔انہیں روٹی اور پیسے سے مطلب ہوتا ہے۔

4۔اقامتی معاشرہ:

اقامتی معاشرہ ایسا معاشرہ ہے جو ایک ہی جگہ قائم رہتا ہے۔دنیا کی اکثریت ایسے ہی افراد پر مشتمل ہے۔ ہمارا معاشرہ بھی اقامتی معاشرہ ہے۔جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں۔صوبہ خیبر پختونخوا اور بلوچستان کے پہاڑی علاقوں میں مقیم قبیلے بھی اقامتی معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دیہی علاقوں کے باشندے ہوں یا بلدیاتی علاقوں کے، جب اپنی غیر منقولہ جائیداد قائم کر لیں تو اقامت اسی جائیداد کے قریب رکھتے ہیں۔غیر منقولہ جائیداد میں زرعی زمین، مکان ،کارخانہ اور فیکٹریاں وغیرہ شامل ہیں۔ایسے معاشرے میں افراد کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ان میں جائیداد کی وراثت کا قانون پایا جاتا ہے۔ایسے معاشرے میں معاشرتی اداروں کی بہتات ہوتی ہے۔

پاکستانی معاشرہ بھی اقامتی معاشرہ ہے۔اس معاشرے کے افراد دیہاتوں اور شہروں میں اپنے اپنے مکان بنا کر زندگی گزارتے ہیں۔زرعی اور سکنی جائیداد کا باقاعدہ قانون ہوتا ہے۔جس کے تحت جائیداد بطور وراثت نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہے۔یہ معاشرہ تغیر پذیر ہوتا ہے۔جبکہ تغیر کی شرح مختلف طبقوں میں مختلف پائی جاتی ہے۔ایسا معاشرہ وسیع تر ثقافت کا حامل ہوتا ہے۔ ایسے معاشرے کا حصہ وہ لوگ بھی ہیں جنہیں ہم قبائلی کہتے ہیں اور یہ ایک ہی جگہ مقیم ہوتے ہیں۔ اقامتی معاشرے میں زمینی حرکت پذیری نہیں پائی جاتی جس کی وجہ سے معاشرتی رسموں اور رواجوں میں تبدیلی قبول نہیں کی جاتی۔ایسے معاشرے میں سماجی اصلاحات ٹھونسی جاتی ہیں افراد آزادانہ طور پر قبول نہیں کرتے کیونکہ وہ اپنے معاشرے کے معاملات کو چھوڑ کر کسی دوسرے راستے پر چلنا قبول نہیں کرتے۔

5۔روایتی معاشرہ:

ایسا معاشرہ جو قدیم روایات کی پاسداری پر قائم ہو روایتی معاشرہ کہلاتا ہے۔یہ معاشرہ زیادہ تر غیر صنعتی ساخت رکھتا ہے۔اس معاشرے میں مشینیں کم سے کم استعمال ہوتی ہیں۔اس

لیے اس معاشرے میں معاشی ادارے سادہ ہوتے ہیں پیچیدہ ادارے نہیں پائے جاتے۔اس معاشرے میں عام طور پر زراعت، تجارت اور صحت کے ادارے پائے جاتے ہیں۔اس معاشرے کا رہن سہن اور بودوباش سادہ اور پرانی طرز کا ہوتا ہے۔بجلی، پانی اور گیس وغیرہ کی سہولتیں نہیں ہوتیں۔ پختہ سڑکیں اور ٹریفک کی روانی اب گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ نظر آنا شروع ہوگئی ہے۔

جدید ذرائع مواصلات کی بھی روایتی معاشرے میں کمی ہوتی ہے۔انٹرنیٹ، فیکس اور ٹیلی فون سمیت دیگر ذرائع وابلاغ لوگوں میں مشہور وقبول نہیں البتہ موبائل فون کی آمد سے لوگوں کی بڑی تعداد مستفید ہورہی ہے۔روایتی معاشرے میں معاشرتی اداروں کی تعداد کم سے کم پائی جاتی ہے اور رسمی ادارے بھی نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔

اس معاشرے میں تعلیم کی کمی کے سبب ایجادات اور دریافتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی۔اس معاشرے میں معاشرتی ترقی بھی سست روی کا شکار ہوتی ہے۔تعلیم کے اعلیٰ ادارے ناپید ہوتے ہیں۔خاص طور پر فنی تعلیم کے اداروں کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔اس معاشرے کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ یہاں ثقافتی اقدار کی مکمل حفاظت کی جاتی ہے اور مذہبی اقدار کی بنیادیں بھی مضبوط ہوتی ہیں۔

6۔جدید معاشرہ:

جدید معاشرہ، روایتی معاشرے کی متضاد خصوصیات کا حامل ہے۔یہ معاشرہ جدید صنعتی ترقی پر قائم ودائم ہوتا ہے۔اس لیے اس کا وجود ترقی یافتہ ممالک میں اور ہمارے ہاں بلدیاتی (شہری) علاقوں میں پایا جاتا ہے۔اس معاشرے میں تعلیمی ترقی اور شہر بندی عام پائی جاتی ہے اور اپنی حدود میں رہتے ہوئے مختلف ادارے لوگوں کو سہولیات فراہم کرتے ہیں۔افراد کی تعداد کثیر ہوتی ہے۔ جدید معاشرے میں معاشرتی زندگی کے بے شمار ادارے پائے جاتے ہیں۔جیسے معیشت میں کاروبار، زراعت، درآمدات، برآمدات اور بنک وغیرہ۔اچھے ذرائع روزگار کی وجہ سے افراد کی آمدنی کے ذرائع بھی وسیع ہوتے ہیں۔اس لیے ان کا معیار زندگی بلند ہوتا ہے۔جدید معاشرے میں لوگوں کو روزگار اور ملازمت کے مواقع عام دستیاب ہوتے ہیں اور معاشرتی زندگی کی تمام

سہولیات آسانی سے میسر ہوتی ہیں۔ خاص طور پر صحت، تعلیم، ذرائع آمدورفت اور رسل ورسائل کے ساتھ ساتھ سیر وتفریح کے مواقع بھی عام میسر آتے ہیں۔ یہ معاشرہ ہر نئی پالیسی، نئے فیشن اور نئے رسم ورواج کو خوش آمدید کہتا ہے۔ نئی اقدا کو پرانی اقدار کے مقابلے میں نہ صرف پسند کرتا ہے بلکہ اقدار کو اپنانے میں فخر محسوس کرتا ہے اور برملا پرانی اقدار سے اظہار ناپسندیدگی کرتا ہے۔ شادی بیاہ اور دیگر رسومات کے معاملہ میں بھی اس معاشرے میں آزادی ہوتی ہے۔ ذات پات کا امتیاز نہیں رکھا جاتا۔ بلکہ جہاں چاہے رشتہ داری طے کر لیتے ہیں۔ جدید معاشرے کے افراد کو معاملات کے تمام جدید ذرائع میسر ہوتے ہیں جن کے استعمال سے نہ صرف لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ زندگی کی آسائشوں کا بھرپور فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔

جدید معاشرہ میں بڑی تیزی سے حرکت پذیری پائی جاتی ہے۔ جدید سفری سہولتوں کی بدولت لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ بڑی تیزی سے پہنچ جاتے ہیں۔ اس معاشرے کے افراد کا دیگر ممالک کے ساتھ بڑا گہرا رابطہ اور تعلق ہوتا ہے۔ یہ رابطہ اور تعلق سیاسی اور کاروباری ہوتا ہے۔ جیسے پاک چائنہ تعلقات، اسلامی ممالک کی تنظیم، سارک تنظیم اور یورپی یونین وغیرہ وغیرہ۔ جدید معاشروں میں چوری، ڈاکا، قبضہ، زناء اور اغواء برائے تاوان جیسے جرائم کی شرح بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس معاشرے میں عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں اور انہیں معاشروں کی نسبت زیادہ آزادی حاصل ہوتی ہے۔

جدید معاشرہ کی عورتیں تعلیم یافتہ اور باشعور ہونے کے ساتھ ساتھ آزاد خیال بھی ہوتی ہیں۔ بعض گھروں میں یہ آزاد خیالی اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ لڑکیاں اور عورتیں مارڈنزم (Modernism) کے نام پر فحاشی کا پرچار کرتی نظر آتی ہیں باریک اور تنگ کپڑے پہن کر دوپٹے سروں سے اتار کر نمائش کا دعوت نظارہ پیش کرتی نظر آتی ہیں چادر جو عورت کی عزت کے ساتھ موسوم کی جاتی ہے عورت نے اتار پھینکی ہے۔ گھریلو معاملات میں عورت کے عمل دخل کے بغیر کوئی بات حتمی اور مکمل نہیں ہوتی۔ بچے اللہ کی نعمت سمجھے جاتے ہیں مگر آج کے جدید دور میں اس رحمت اور نعمت کو بھی منصوبہ بندی کر کے "چھوٹا خاندان، خوشحال گھرانہ" کا اصول اپنا لیا گیا ہے۔

طبقہ اور معاشرہ میں فرق

طبقہ اور معاشرہ دونوں ہی اگر چہ افراد کا گروہ ہیں۔ مگر دونوں میں مماثلت کے ساتھ ساتھ کچھ اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔ جہاں تک مماثلت کی بات ہے دونوں میں افراد پائے جاتے ہیں اور دونوں میں معاشرتی زندگی کے ادارے ہوتے ہیں۔ طبقہ اور معاشرے کے لوگ آپس میں پیار و محبت کے بندھن سے بندھے ہوتے ہیں دونوں کی قومی اقدار ایک جیسی ہوتی ہیں۔ باوجود اس کے بعض معاملات میں اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔ طبقہ چھوٹے سے چھوٹا بھی ہوتا ہے۔ جیسے ایک محلّہ ایک بستی یا ایک گاؤں وغیرہ اور بڑے سے بڑا بھی ہوتا ہے۔ جیسے ایک معاشرہ یا دنیا کے سارے معاشرے مل کر ایک طبقہ بنتے ہیں۔ معاشرہ ایک خاص جغرافیائی حدود میں رہتا ہے جیسے پاکستانی معاشرہ، سعودی معاشرہ، ایرانی معاشرہ، افغانی معاشرہ وغیرہ جبکہ طبقہ افراد کا ایسا گروہ ہے جو ایک مقام پر رہتے ہوں۔

☆ معاشرہ کے افراد کے مابین نہ جان پہچان اور نہ ہی باہمی میل جول کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

☆ طبقہ کے افراد ایک دوسرے سے جان پہچان بھی رکھتے ہیں اور ایک دوسرے سے خوب روابط رکھتے ہیں۔

☆ معاشرے کے مسائل ملک گیر ہوتے ہیں۔

☆ طبقہ کے مسائل مقامی ہوتے ہیں۔

☆ معاشرے میں قومی اقدار پائی جاتی ہیں۔

☆ طبقہ کے افراد میں قومی اور مقامی دونوں اقدار پائی جاتی ہیں

☆ معاشرے کی ضروریات بہت وسیع ہوتی ہیں۔ جو دوسرے معاشروں کی مدد کے بغیر پوری ہونی ناممکن ہوتی ہیں۔

☆ طبقہ عام طور پر اپنی ضروریات میں خود کفیل ہوتا ہے۔

☆ معاشرہ مختلف ذیلی ثقافتوں سے مل کر بنتا ہے۔ جیسے سندھی، پنجابی، پختون اور بلوچی ثقافتیں مل کر پاکستانی معاشرہ کی ثقافت تشکیل دیتی ہیں۔

☆ طبقہ ایک خاص ثقافت کا گہوارہ ہوتا ہے۔

☆ معاشرے میں رسمی ذرائع سے سماجی ضبط اور معاشرے میں توازن رکھا جاتا ہے۔

☆ طبقہ میں معاشرتی یا سماجی ضبط غیر رسمی ہوتا ہے۔

باوجود ان اختلافات کے معاشرہ اور طبقہ کا ایک دوسرے کے ساتھ چولی دامن کا تعلق ہے۔

سماجی طبقات کا معاشی حوالہ

معاشرے میں کچھ لوگوں کا مقام و مرتبہ دوسروں سے بلند و اعلیٰ ہوتا ہے اور کچھ پیشہ ور لوگ دوسرے پیشہ ور لوگوں سے زیادہ معتبر اور معزز سمجھے جاتے ہیں اسی طرح کچھ ذاتیں دوسری ذاتوں کے مقابلے میں زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ اس مقام و مرتبے میں اونچ نیچ جو لوگوں کو معاشرے میں حاصل ہے اس درجہ بندی کی بنیاد بنتی ہے۔ جس پر معاشرے کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ عام طور پر معاشرے کو تین بڑے گروہوں یا درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جنہیں اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ درجہ کہتے ہیں۔ ہر درجہ کے فرد تقریباً یکساں معاشی رتبہ رکھتے ہیں۔ جیسے ہمارے معاشرے کے اعلیٰ درجے میں بڑے زمیندار، کارخانہ دار، اعلیٰ درجہ کے ملازمین، علماء اور دینی بزرگ وغیرہ شامل ہیں۔ درمیانے درجے میں چھوٹے زمیندار، چھوٹے تاجر و دکاندار، متوسط طبقہ کے ملازمین، فنی و نیم فنی مزدور وغیرہ شامل ہیں۔ جبکہ ادنیٰ درجے میں معمولی دوکاندار، مزارع، غیر فنی مزدور، بے روزگار اور ادنیٰ درجے کے ملازمین وغیرہ شامل ہیں۔

سماج کے اعلیٰ درجے میں شامل بڑے بڑے جاگیر دار اور زمیندار، کارخانہ دار، فیکٹری مالکان، اعلیٰ عہدوں پر فائز سول اور فوجی افسران بالا شامل ہیں انہیں زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے میں کسی قسم کی مشکل نہیں ہوتی۔ ان کے بچے تعلیم حاصل کرنے بیرون ملک جاتے ہیں جو اپنے بچوں کو بیرون ملک نہیں بھیجنا چاہتے ان کے پاس وافر وسائل کی موجودگی ان کے بچوں کو اپنے ملک کے مہنگے ترین اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم مہیا کرواتی ہے۔ ایسے لوگ اپنے علاج و معالجے کے لئے پرائیویٹ اور مہنگے ہسپتالوں کا رخ کرتے ہیں۔ جہاں ہسپتال تمام تر سہولیات سے مزین ہوتے ہیں۔ اس درجے کے لوگوں نے اتنی دولت اکٹھی کر رکھی ہے کہ اکثر نے بیرون ملک میں

اپنے کاروبار اور کمپنیاں بنائی ہوئی ہیں۔ان کا مقصد اپنی تجوریاں بھرنا اور پر آسائش زندگی گزارنا ہے۔بڑے بڑے ہوٹلوں میں دعوتیں اور تقریبات کا انعقاد کر کے یہ لوگ اپنی امارت کا حساس دلاتے ہیں مگر ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ یہ ملک کے وسائل پر قابض ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

سماج کے درمیانے طبقے میں چھوٹے زمیندار، چھوٹے دوکاندار، تاجر، متوسط طبقے کے لوگ، فنی اور نیم فنی مزدور حضرات شامل ہیں۔یہ لوگ اگرچہ پر تعیش زندگی تو نہیں گزارتے مگر خوشحال زندگی ضرور گزارتے ہیں۔بچوں کے لیے بیرون ممالک کی یونیورسٹیاں نہ سہی مگر اچھی شہرت کے حامل تعلیمی اداروں میں متبادل تلاش کر لیتے ہیں۔علاج و معالجہ بھی اچھے اور معیاری ہسپتالوں میں کروا سکتے ہیں۔ملازمت پیشہ لوگ رشوت لینے کے عادی ہو جاتے ہیں اور پیسے کی خاطر قومی فریضہ بھول جاتے ہیں۔درمیانے درجے کے لوگوں کو معاشرے میں اپنا مقام و مرتبہ بنانے کے لیے سخت محنت اور جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ملک کی آبادی کے لحاظ سے ان کی تعداد اعلیٰ درجے کے مقابلے میں کافی زیادہ ہوتی ہے۔

ادنی درجے میں مزارع ،معمولی دوکاندار ،غیر فنی مزدور، بیروزگار اور ادنیٰ درجے کے ملازمین وغیرہ شامل ہیں۔ملکی آبادی کا زیادہ تر حصہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے۔جنہیں نہ تو اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے کے مواقع میسر آتے ہیں اور نہ صحت کی سہولیات میسر ہوتی ہیں۔جاگیردار اپنی برتری قائم رہنے کے لیے اپنے علاقوں میں سکول قائم نہیں ہونے دیتے کہ غریب کے بچے پڑھ لکھ کر ان کے مدمقابل نہ آ جائیں۔بے روزگاری اور غربت کے مارے یہ لوگ چوری اور ڈاکے ڈالنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔اس طرح معاشرے میں برائیوں کی شرح بڑھتی جاتی ہے۔

کئی خاندانوں میں جہیز نہ ہونے کی وجہ سے بیٹیوں کی شادی نہیں ہو پاتی اور وہ والدین کی دہلیز پر پڑی رہتی ہیں۔سیاستدان ووٹ ملنے کے دنوں میں ان کی زندگیاں بدلنے کے لیے بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں مگر ووٹ لینے کے بعد وہ اپنے وعدوں کو عملی جامہ نہیں پہناتے اور وعدے صرف زبان تک ہی رہ جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ادنیٰ درجے کے لوگوں کے مسائل کم ہونے کی بجائے بڑھتے جاتے ہیں اور وہ لوگ زندگی کی راہوں میں پستے رہتے ہیں۔

پاکستانی سماج میں معاشی امتیاز:

سماج کی پیداواری سرگرمیوں میں وہ تمام عوامل شامل ہیں جن کے نتیجے میں مال اور خدمات پیدا کی جاتی ہیں۔ ہر علاقے کے ماحول اور حالات کے مطابق پیداواری سرگرمیاں وجود میں آتی ہیں۔ دیہی زندگی کی پیداواری سرگرمیاں شہری زندگی کی سرگرمیوں سے مختلف ہیں۔ صرف زراعت ہی وہ پیشہ نہیں ہے جس میں معاشی سرگرمیاں پائی جاتی ہیں بلکہ زراعت سے متعلق اور بھی پیشے ہیں جیسے لوہار، ترکھان، موچی، نائی، کمہار، زرعی مزدور وغیرہ جو تمام کسی نہ کسی صورت میں کسان کے معاون ہوتے ہیں اور اس کے لیے خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ اس کی ضروریات زندگی پوری کرتے ہیں اور وہ عام طور پر فصل کے موقع پر کچھ حصہ دے کر ان کا معاوضہ ادا کرتا ہے۔ اسی طرح سرکاری ملازمین کا ایک گروہ بھی کاشتکاری کی خدمات کے لیے مقرر ہوتا ہے۔ جیسے سکول کا استاد، نہری و مالی پٹواری، زراعت انسپکٹر اور ڈنگر ڈاکٹر وغیرہ وہ سرکاری ملازمین ہیں جن کے بغیر کاشتکاری کا نظام نہیں چل سکتا۔ نمبردار بھی کاشتکاری سے معاملہ وصول کر کے سرکاری خزانے میں جمع کرواتا ہے اور ان کے جھگڑے وغیرہ طے کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ گاؤں کا دوکاندار کاشتکار کے لئے نہایت اہم ہوتا ہے۔ کیونکہ عام ضرورت کی چھوٹی چھوٹی اشیاء اسے وہیں سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔ معمولی چیزوں کے لیے اسے شہر نہیں جانا پڑتا ہے۔ اس طرح یہ سب لوگ مل کر کاشتکاری کی ضرورت وہاں پر ہی پوری کر دیتے ہیں، جس سے مطمئن ہو کر وہ اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ دیہی معاشرہ میں پیشے سادہ اور محدود ہیں کیونکہ دیہی معیشت سادہ اور ایک ہی قسم کی ہے۔

شہری زندگی میں پیشے پیچیدہ اور بے شمار ہیں۔ دیہی ماحول میں پیشے کے چناؤ میں مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ عام طور پر لوگ جدی پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ پیشے تبدیل بھی کیے جا سکتے ہیں مگر اس کے لیے زیادہ محنت درکار ہوتی ہے۔ تعلیم حاصل کر کے ایک مراسی کا بیٹا ڈاکٹر، پروفیسر، انجینئر، جج، وکیل، یا بڑا کاروباری آدمی بن سکتا ہے۔ زرعی و دیہی سماج اور صنعتی و کاروباری سماج ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔

فرد اور سماج

فرد اور سماج ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں۔ نہ تو سماج کا تصور فرد کے بغیر ممکن ہے اور نہ فرد سماج کے بغیر اپنی ضروریات اور خواہشات کو پورا کر سکتا ہے۔ اس لحاظ سے فرد اور سماج کا دورخی تعلق ہوتا ہے اور اگر ہم فرد اور سماج کی اہمیت کو ایک دوسرے کے بغیر سمجھنے کی کوشش کریں گے تو وہ صریحاً غلط ہوگا۔ فرد سماج میں رہ کر ہی " انسان " کہلا سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انسان میں مخفی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ لیکن ان مخفی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں سماج زبردست محرک ثابت ہوتا ہے۔

ہم ایسے تجربے کا خیال بھی نہیں کر سکتے کہ انسان کے بچوں کو سماج کے ماحول سے جدا کر کے ان کی جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی نشو ونما کا مشاہدہ کر سکیں۔ شعوری طور پر اس قسم کا تجربہ تو ممکن نہیں لیکن البتہ بعض حادثات اور واقعات ایسے ضرور پیش آئے ہیں کہ جب چند انسانی بچوں کی نشو ونما غیر صحت مندانہ اور غیر انسانی ماحول میں ہوئی۔ اکثر سماجیات کی کتابوں میں ان بچوں کی مثالیں بکثرت دی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکا تو سیاسی حادثے کا شکار ہوا۔ دوسرا کیس ان دو بچیوں کا ہے جو بھیڑیے کی گود میں پائی گئیں اور تیسرا کیس اس لڑکی کا ہے جس کی پیدائش ناجائز تھی 1828ء میں شہر نیورمبرگ جرمنی میں ایک سترہ سال کے لڑکے کا پتہ چلا تھا جو بمشکل کھڑا ہو سکتا تھا اور جس کی دماغی صلاحیت بچوں کی طرح تھی۔ یہ لڑکا سیاسی حادثات کا شکار تھا۔ بچپن سے اسے ایک کسان کے گھر رکھا گیا تھا اور کسان کو سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ اس لڑکے کی پرورش ایک مقفل کمرے میں کی جائے۔ اسی کمرے میں کاسپر ہاؤزر (Houser Kasper) کی زندگی کے سترہ سال بیت گئے۔ جب اسے رہا کیا گیا۔ تو وہ صرف پانچ سال زندہ رہ سکا۔ مرنے کے بعد اس کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے ظاہر ہوا کہ اس کا دماغ سب نارمل (subnormal) تھا۔ اس لحاظ سے اس لڑکے جس کا نام کاسپر ہاؤزر (Houser Kasper) تھا کو سماجی تعلقات سے محروم کر کے اس کی جسمانی، نفسی اور ذہنی نشو ونما کو کچل دیا گیا تھا۔

1920ء میں دو لڑکیوں املا اور کملا کا ایک بھیڑ کی گود میں ہونے کا پتہ چلا۔ املا دو سال کی اور کملا آٹھ سال کی۔ املا تو بہت جلد مر گئی لیکن کملا نو سال زندہ رہی۔ جانوروں کے ساتھ ربط کی وجہ

سے کملا کے طور طریقے بالکل غیر انسانی تھے۔ وہ چوپایوں کی طرح چلتی اور بھیڑیوں کی طرح چیختی تھی اور انسانوں سے اس طرح گھبراتی تھی جس طرح جانور گھبراتے ہیں۔ اسے پکی ہوئی غذا کے مقابل میں ہڈیاں اور کچا گوشت زیادہ پسند تھا۔ غذا کو منہ تک پہنچانے میں وہ ہاتھ کا استعمال نہیں کرتی تھی۔ بلکہ جانوروں کی طرح منہ سے چاٹ لیتی تھی۔ لیکن جب اسے انسانوں کے ساتھ رکھا گیا اور آہستہ آہستہ اسے انسانی سماج کے طور طریقوں سے واقف کروایا گیا تو کھانے پینے، پہننے، رہنے سہنے اور میل ملاپ کے طریقوں میں تبدیلی آنے لگی۔ وہ مرنے سے پہلے کچھ بات بھی کرنے لگی تھی۔

1838ء میں سماجیات اور نفسیات کے ماہرین کو ایک 5 سالہ لڑکی "اینا (Anna)" کا پتہ چلا جو ناجائز تعلقات کا نتیجہ تھی۔ جس کی بنا پر اس کی ماں نے اسے ایک کمرے میں مقفل کر دیا تھا۔ لہٰذا اینا کا ربط اپنی ماں سے جو رہا جو اسے دودھ پلانے کی غرض سے کمرے میں جاتی تھی۔ اس ظالمانہ سماجی علیحدگی کی بنا پر اینا نہ تو بات کرنے کے قابل تھی اور نہ ہی چل پھر سکتی تھی اور انسانوں سے بہت گھبراتی تھی۔ ان تمام کیسوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ سماج سے علیحدگی کا نتیجہ انسان کو ان تمام صلاحیتوں سے محروم کر دیتا ہے جو سماج میں زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہیں۔ وہ جسمانی طور پر آدمی کی اولاد ہوتے ہوئے بھی نہ تو بات چیت کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں اور نہ اپنا جسم ڈھانپنے کا انہیں احساس ہوتا ہے۔ نہ کھانے پینے کا ڈھنگ اور نہ زندگی گزارنے کا کوئی انداز ہنہ تو ان لوگوں کی صحیح جسمانی نشو ونما ممکن ہے اور نہ نفسی اور ذہنی۔ یہ سماجیت اور اکتساب کے طریق کا اثر ہے کہ ایک حیاتیاتی عضو کو یہ سماجی عضو میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ جس کی بدولت شخصیت کی نشو ونما ہوتی ہے۔ جسے یہ فضاء یا سماجی ماحول میسر نہیں آتا تو وہ جانوروں کی طرح زندگی گزارتا ہے۔ غرض ہماری بول چال، رہن سہن، میل جول کے طریقے، انداز فکر سب ہی سماجی بین عمل اور سماجی ربط کا نتیجہ ہیں۔

فرد بذات خود نہ تو ابتدا ہے اور نا انتہا بلکہ اس کی حیثیت سماج کی کڑی میں پروئے ہوئے دانوں کی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ہمارا تعلق سماج سے صرف اتنا نہیں ہوتا جتنا بیج کا زمین سے ہوتا ہے اور جب پودا اگ جاتا ہے۔ اور اسے دوسری طرف آسانی سے منتقل کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا انسان کی نشو ونما کے لیے سماج کا وجود ضروری ہے اور وہ سماجی ورثہ اہم ہے۔ جو برس ہا برس کے تجربوں کا

نچوڑ ہوتا ہے اور وہ تمام افراد اور ذرائع جو قدم قدم پر شخصیت کو ڈھالنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ غرض انسان کی نشو ونما جس حد تک سماجی ورثے پر منحصر ہے اس سے ارسطو کے قول کی تائید ہوتی ہے کہ "انسان سماجی حیوان ہے"

سماجی زندگی کی خواہش ایک جبلت ہے جو قدرت نے انسانی فطرت میں داخل کر دی ہے اور وہ شخص جو سماجی زندگی پسند نہ کرے اور جسے حاجت نہ ہو وہ دیو ہے یا دیوتا ہے۔ انسان جب تک سماج میں نہیں رہتا۔ اس وقت تک اس کی سرشت میں جو قوتیں مضمر ہیں وہ پوری طرح ظہور میں نہیں آسکتیں اور نہ اس کی زندگی مکمل ہوسکتی ہے۔ سماجی زندگی کی جبلی خواہش شہد کی مکھیوں اور غول میں رہنے والے جانوروں میں بھی ہوتی ہے مگر وہ سماجی حیوان اس لیے نہیں کہلا سکتے کہ ان میں "ہم شعور (kindofconscious)" نہیں پایا جاتا جو سماجی زندگی کی بنیاد رکھتا ہے۔ انسان زندگی کی تشکیل کے لیے سماج اور سماجی زندگی کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ تعلق دورخی ہوتا ہے بلکہ جس طرح افراد سماج سے اثر قبول کرتے ہیں اسی طرح افراد کا انداز فکر، ان کی جدوجہد، ان کے کارنامے سماج کے رخ کو پلٹا دیتے ہیں افراد کے بغیر کوئی سماجی قوت کام نہیں کر سکتی۔

افراد کی دلچسپیاں، ان کے رجحانات اور ملانات، ان کی امید وبیم سماج کے افعال اور، قاصد کا یقین کرتے ہیں۔ افراد اپنی مختلف صلاحیتوں کی بنا پر سماجی ورثے میں اضافہ کرتے ہیں۔ مثلاً ادیب، ڈاکٹر،، انجینئر، فن دان، سائنسدان، مصور، موسیقار غرض سب ہی اپنی نجی صلاحیتوں کی بنا پر سماجی زندگی کے معیار کو اونچا کرتے ہیں اور آنے والی نسلوں کے لیے ایسا سماجی ورثہ چھوڑ جاتے ہیں، جس سے وہ مستفید ہوتے ہوئے اس میں مزید اضافہ کر سکتے ہیں۔ کبھی کبھی افراد اور سماج میں تصادم بھی ہوتا ہے۔ خصوصاً جب انفرادیت کے حامی سماج کے مروجہ طور طریقوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں جس کی وجہ سے سماج کے معیاروں اور قدروں میں ردوبدل ہوتا رہتا ہے۔

سماج کے نظریے (TheoriesofSociety)

سماج کی ابتدا کے بارے میں جو نظریے پیش کیے گئے ہیں ان میں تین نظریے بہت اہم ہیں۔

1- نظیریہ معاہدہ (TheoryContract)

2- نظریہ عضویت (TheoryOrganismic)

3- نظریہ اجتماعی شعور (Theorymind-Group)

1۔نظریہ معاہدہ (TheoryContract)

نظریہ معاہدہ سماج کی ابتداء کے بارے میں جو نظریہ معاہدہ پیش کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں تھامس ہابس (Hobbes Thomas 1588-1673) جان لاک (Lock John 1632-1704) اور ژان ژاک روسوک (Rousseau Jacques Jean 1712-1778) کے خیالات غور طلب ہیں۔ہابس کی مشہور تصنیف "LAVIATHAM" ہے، جس کا لفظی معنی "بڑا کبری جہاز" ہیں۔مگر ہابس کی مراد ایک عظیم الشان ہستی ہے، جو بہت سی ہستیوں کے ایک میں ملنے سے بنی ہو۔ یہ کتاب جس میں قانون فطرت اور سماجی معاہدے کے نظریے سے بحث کی گئی ہے۔1651ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب میں ہابس نے انسانی سرشت کی عام خصوصیتیں بیان کی ہیں۔

ہابس کا کہنا ہے کہ فطرت نے تمام انسانوں کو ذہنی اور جسمانی قوت کے لحاظ سے یکساں بنایا ہے۔ چونکہ سب کے استعداد کم وبیش برابر ہوتی ہے۔اس لیے سب کی خواہشیں اور انہیں پورا کرنے کی امید بھی برابر ہوتی ہے۔لیکن انسان کی سرشت ایسی ہے کہ یہ مساوات ہی دائمی فساد کا باعث ہوتی ہے۔کوئی شخص اپنے آپ کو کمتر ماننے پر راضی نہیں ہوسکتا۔ بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اس کی برتری تسلیم کرلی جائے۔ کیونکہ ہر ایک کو بڑا بننے کا شوق ہوتا ہے۔لیکن ساری امیدوں اور آرزوؤں کا انحصار ہر شخص کی اپنی قوت پر ہوتا ہے۔کوئی کسی پر بھروسہ نہیں کرتا بلکہ ہر ایک کو ہر وقت یہ اندیشہ رہتا ہے کہ اس کی جان نہ چلی جائے یا اس کی سب سے عزیز ملکیت چھن جائے گی۔ یہ ایسی صورتحال ہوتی ہے جس میں ہر شخص دوسرے کا دشمن ہوتا ہے۔ کیونکہ جنگ صرف اسی حالت کو نہیں کہتے جب لڑائی ہو رہی ہو اصل میں جب تک یہ طے نہ ہو جائے کہ امن قائم ہو گیا ہے اور اسے قائم رکھنے کا کوئی ذمہ دار ہے تب تک جنگ کی حالت رہتی ہے اور اس حالت میں انسان علم، فن، آسائش اور زندگی کی ہر قابل قدر نعمت سے محروم رہتا ہے۔ یہ نعمتیں اسی وقت حاصل ہوسکتی ہیں جب تک انسان کو جان مال کا خطرہ نہ ہو۔ جنگ کی حالت میں انسان کی زندگی بے مایہ، تلخ، بہیمانہ اور مختصر ہو

جاتی ہے۔لہٰذا ہر شخص اپنی قوتوں کو جس طرح چاہے اپنی جان کی حفاظت کے لیے استعمال کرتا ہے۔اس حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہابس نے "فطرت کے قانون (right Nature)" کا اصول پیش کیا ہے۔

قانون فطرت وہ اصول یا عام قاعدہ ہے۔ جسے عقل نے دریافت کیا اور جس کے مطابق انسان کے لیے ایسا رویہ ممنوع قرار دیا جاتا ہے جو اس کی زندگی کے لیے مہلک ہو یا جس میں اس کی حفاظت کے بہترین ذریعے نظر انداز کر دیئے جائیں۔انسان کی سرشت کی ایک نمایاں خصوصیت جسے ہابس نے پہلے فنی طور پر اور بعد میں بڑے شدومد کے ساتھ بیان کیا ہے۔وہ خوف ہے۔اگر خوف نہ ہوتا تو مستقل جنگ کی حالت انسان کو ناگوار ہی نہ ہوتی۔ وہ سماج اور سیاسی زندگی کی پابندیوں کو کسی طرح برداشت کرنے پر آمادہ نہ ہوتا۔ان جذبات میں سے جو انسان کو امن کی طرف مائل کرتے ہیں۔ایک تو موت کا ڈر ہے، دوسرے ان چیزوں کی خواہش جو آسودہ زندگی کے لیے ضروری ہیں اور تیسرے اس کی یہ توقعات کہ یہ چیزیں محنت کے ذریعے حاصل ہو جائیں گی۔عقل امن وامان کی مناسب شرطیں پیش کرتی ہے جن کو ماننے کے لیے لوگ آمادہ کیے جاسکتے ہیں۔

یہی ہابس کے نزدیک سماجی معاہدے کی اصلیت ہے۔لہٰذا انسان اپنی سلامتی کی نیت سے جو عہد یا وعدہ کرے اس کی پابندی لازمی ہے۔چاہے اس کا سبب دباؤ اور خوف ہی کیوں نہ ہو۔مثلاً اگر کوئی قیدی اپنی جان بچانے کے لیے پیسہ دینے یا کسی اور چیز کا وعدہ کرتا ہے تو یہ باقاعدہ معاہدہ اسے ضرور پورا کرنا چاہئے۔اس سلسلے میں ہابس معاہدے کی تعریف بھی کرتا ہے۔معاہدے کے معنی ہیں دو یا دو سے زیادہ اشخاص کے درمیان حقوق کا مبادلہ جس کی ایک صورت یہ ہے کہ بہت سے لوگ کسی ایک بات کا عہد و پیماں کرلیں اور اس کی پابندی کریں۔جان لاک نے ہابس کے جواب میں فطری زندگی کا نقشہ بالکل مختلف رنگ میں کھینچا ہے اور قانون فطرت کی جداگانہ طرز پر تعریف کی ہے۔اس کے نزدیک فطری زندگی میں ہر طرح کا اطمینان، آسودگی اور آزادی میسر تھی۔

قانون فطرت جس کا قانون یہ ہے کہ انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرے جیسا کہ وہ چاہتا ہے کہ دوسرے اس کے ساتھ کریں۔لوگوں کو فساد سے محفوظ رکھتا ہے۔ہر شخص کے دل میں اس قانون کی قدر ہوتی ہے اور صرف وہ ہی اس پر عمل نہیں کرتا بلکہ دوسروں سے بھی جہاں

تک ممکن ہو سکے اس کی پیروی کراتا ہے۔ خالص نقطہ نظر سے فطری زندگی کی دو خصوصیات سب سے زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔ انفرادی آزادی اور ملکیت کا حق جسے سب یکساں تسلیم کرتے ہیں۔ جب سماج قائم کیا جاتا ہے تو فطری زندگی کی یہی دو خصوصیات ہیں جن کا باقی رکھنا مقدم سمجھا جاتا ہے اور اجتماعی معاہدے طے کرتے وقت لوگوں کو انہی کی سب سے زیادہ فکر ہوتی ہے۔ سماج قائم کرنے کی ضرورت اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ لوگ فطری زندگی سے بیزار ہو جاتے ہیں بلکہ صرف اس غرض سے کہ آپس میں انصاف کرنے کا بہتر نظام قائم ہو جائے۔ ہر شخص کا ضمیر اسے قانون فطرت کی پابندی کرنے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔ لیکن ضمیر خواہ کتنا ہی بیدار ہو اس کے لیے اپنے معاملات میں خود انصاف کرنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ یہ بھی نہ ممکن ہے کہ عام انسانی سرشت اتنی نیک ہو جائے کہ دنیا میں مفسد باقی نہ رہیں۔ اس لیے فطری زندگی میں بھی ہر شخص اپنی جگہ منصف اور محافظ امن کے فرائض انجام نہیں دے سکتا اور اس کی ضرورت پڑتی ہے کہ عدل و انصاف کے قیام اور جان و مال کی حفاظت کے لیے کوئی انتظام ہو۔ اس لیے انسان اپنی فطری حقوق کے تحفظ کے لیے سماجی معاہدے میں داخل ہوتا ہے۔ حکومت اور قانون سازی کے ادارے قائم کرتا ہے۔

لاک نے اجتمائی معاہدے کی شرطیں بیان نہیں کی ہیں۔ اس وجہ سے لاک کی نظر میں معاہدے اور اس کی شرطوں سے زیادہ اہم حاکموں کے درمیان حقوق اور اختیارات کی تقسیم ہے۔ ان کا کام جان، مال اور انفرادی آزادی کا تحفظ وغیرہ کا انتظام اور ایسے قانون وضع کرنا ہے۔ جن میں قانون فطرت ایک معین حاکم کی حیثیت ایک اعلیٰ خادم کی سی ہے۔ اسے اپنے اقتدار کو اپنی رعایا کی دین سمجھ کر ان کا احسان ماننا چاہئے۔ حاکم ہر طرح سے پابند ہوتا ہے۔ رعایا کسی اعتبار سے پابند نہیں ہوتی اور اسے ہر وقت اس کا حق حاصل ہے کہ حاکم کو معزول کر دے۔

ہابس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ اگر حکومت کی اقتدار میں کمی ہو جائے یا رعایا نے اس کی باقاعدہ مخالفت شروع کر دی تو سماج اور ریاست دونوں تباہ ہو جائیں گے۔ لاک کا عقیدہ تھا کہ حاکم بدلنے سے سماج منتشر نہیں ہو جاتا۔ بس ایک شخص یا چند اشخاص کی بجائے حکومت کے فرائض کی انجام دہی دوسرے لوگوں کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ حکومت کو قائم رکھنے کے لیے رعایا کا کسی قسم کے ایثار کا مطالبہ کرنا بے جا ہے۔ حاکم کو کسی حالت میں رعایا کی جان تو بڑی بات ہے۔

اس کے مال تک کوئی اختیار نہیں ہوسکتا۔ افراد کی خواہشوں اور ان کے حقوق کا لحاظ کرنا ہر صورت میں ان کا فرض ہوتا ہے۔ اگر فطری زندگی کا وہ خاکہ جو لاک نے پیش کیا ہے۔ صحیح مان لیا جائے اور فرض کرلیا جائے کہ انسان بغیر کسی خارجی دباؤ کے آسودگی سے زندگی گزار سکتے ہیں اس لیے ان کی سرشت میں فطرت نے صلاحیت رکھی ہے اور قدرت نے اس کے قوانین کو جن پر ایسی زندگی کا دارومدار ہوتا ہے۔ پیدائش کے ساتھ ہی انسان کے ذہن میں ودیعت کردی ہے تو پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ سماجی معاہدے اور سیاسی ادارے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے۔

لاک نے اس کا سبب بتایا ہے کہ راست روی کی عام خواہش کے باوجود آپس کے تعلقات میں ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوجایا کرتی ہیں کہ عدالتی فیصلے کی ضرورت ہوتی ہے اور انسان خواہ دوسروں کے معاملات طے کرنے میں کتنا ہی موقع شناس اور راست باز ہو۔ ذاتی مفادات اور معاملات میں اسے اپنی غیر جانبداری پر یقین نہیں رہتا اور وہ چاہتا ہے کہ اپنے معاملات میں کسی غیر شخص سے فیصلہ کرائے۔

لاک کا کہنا ہے کہ سماج میں خواہ وہ مفسدوں سے کتنا ہی پاک ہو۔ چند ایسے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جو عام معیار کی پابندی نہیں کرتے۔ ایسے لوگ فطری دور میں بھی تھے۔ بجائے اس کے کہ ہر شخص اپنی قوت بازو سے اپنے حقوق کا تحفظ کرے اور دوسرے لوگوں کی بھی مدد کرے۔ یہ زیادہ مناسب سمجھا گیا کہ سب مل کر ایک معاہدہ کرلیں جس سے سب کو یکساں فائدہ پہنچے۔

روسو کی آرزو تھی کہ تہذیب ان امراض سے پاک کردی جائے۔ جو اس میں پیدا ہو گئے ہیں۔ وہ زنجیریں توڑ دی جائیں جنھوں نے انسان کو اور اس کی طبیعت کو بالکل جکڑ دیا ہے۔ ایسی نیت سے پہلے تہذیب پر حملہ کیا۔ روسو اور اس کے مداحوں کے نزدیک فطری حالت کی طرف واپس جانے کے معنی یہ تھے کہ زندگی کے لیے نئے اور بہتر اصول اختیار کیے جائیں۔ انسانوں کی تقسیم خواص اور عوام میں نہ کی جائے۔ شہریوں کی حیثیت سے سب کا مرتبہ برابر ہو اور سیاسی زندگی کے معنی شرفا اور درباریوں کی خوشامد اور حاکموں کی زیادتیوں کو برداشت کرنا نہ ہو بلکہ ایک اجتماعی جدوجہد میں شریک ہونا اور فرائض عامہ کو انجام دینا ہو۔

روسو کہتا ہے کہ ہمیں ہابس کی طرح یہ نہ طے کرلینا چاہئے کہ نیکی کا کوئی تصور نہ ہونے کی وجہ

سے انسان لازمی طور پر برا ہوگا۔ انسان آزاد تھا، بے پرواہ تھا، نہ دکھ سہتا تھا، نہ دکھ پہنچاتا تھا، اس کی ضرورتیں اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے طریقے دونوں محدود تھے لیکن وہ اس حالت میں قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ انسان اور حیوان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ انسان صاحب اختیار ہوتا ہے۔ جبلی خواہشوں کے علاوہ اس میں اپنا ارادہ ہوتا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے ترقی کرنے اور درجہ کمال تک پہنچنے کی استعداد، آب و ہوا اور دوسرے نظری محرک انسانوں کو اپنے قوت ایجاد کو کام میں لانے اور اپنی زندگی کو بہتر بنانے پر مجبور کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ باہمی امداد کی قدر کو پہچاننے لگتے ہیں۔

سماجی معاہدے سے متعلق ہابس، لاک اور روسو کے جو خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں بنیادی عنصر یہی ہے کہ سماج کے وجود میں آنے کی وجہ سے زندگی میں نظم و تربیت پیدا ہوتی ہے۔ سماج کی نشو ونما اور اس کی ترقی میں انسانی سعی کا بڑا دخل ہے۔ انسان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ انصاف، امن اور آزادی کے پیش نظر سماج کے ارکان کے درمیان مساوات اور ہم آہنگی کو برقرار رکھے۔

2۔ نظریہ عضویت (Theory of Organism)

عضویت کا نظریہ بہت پرانا ہے۔ زمانہ قدیم سے مغرب اور مشرق کے مفکرین اس نظریے سے متعلق غور و حوض کرتے رہے ہیں۔ جن میں افلاطون، ارسطو، روسو اور کوٹلیا بہت مشہور ہیں۔ ان تمام مفکرین نے ریاست کو ایک عضویہ قرار دیا ہے۔

اسپنسر 1820ء-1930ء نے اس نظریہ کا اطلاق وسیع پیمانے پر کیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ریاست ہی نہیں بلکہ سماج ایک مثل جاندار شے کے ہے۔ جس طرح ایک حیاتیاتی عضویے کی بقاء کا دارومدار تمام اعضا کی موجودگی اور صحت پر مبنی ہوتا ہے اس طرح سماج کا وجود تمدن کے دوسرے اجزا کے وجود کا مرہون منت ہے۔ اسپنسر اپنی بحث اس مفروضے سے شروع کرتا ہے کہ سماج اور حیاتیاتی عضویہ ہے۔ اس مفروضے کی وہ منطقی توجیہہ بھی کرتا ہے۔ جسے بعد کے مفکرین ایک سائنسی غلطی قرار دیتے ہیں۔

اسپنسر سماج اور حیاتیاتی عضویے میں جن مشابہتوں کا ذکر کرتا ہے وہ یہ ہیں:

1- انسان سماج اور حیاتیاتی عضویوں میں بتدریج نشو ونما ہوتا ہے۔

2- انسانی سماج اور عضویوں میں یہ خصوصیت مشترک ہے کہ دونوں کا اجزا ایک دوسرے پر منحصر ہوتے ہیں۔

3- انسانی سماج اور حیاتیاتی عضویوں کے مختلف اجزا آزادانہ طور پر اپنا فعل بھی انجام دیتے ہیں اور ایک دوسرے سے مدد بھی لیتے ہیں۔ نظریہ عضویت کی تشریح کرتے ہوئے اسپنسر صرف مشابہتوں کا ذکر نہیں کرتا بلکہ ان دونوں میں جو برہمی فرق پایا جاتا ہے ان کی بھی وضاحت کرتا ہے۔

1- سماج کی کوئی مخصوص اور واضح شکل نہیں ہوتی۔

2- سماج کی اکائیاں کوئی خاص مقام پر نہیں پائی جاتیں اور نہ وہ ایک دوسرے سے پیوست رہتی ہیں۔

3- سماج کے اجزا میں نسبتاً زیادہ حرکت پذیری پائی جاتی ہے۔

سماج کا ہر فرد احساسات اور فراست کا ایک مرکز ہوتا ہے۔ اسپنسر کا خیال تھا کہ مشابہتوں سے زیادہ سماج اور حیاتیاتی عضویوں میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ بہت زیادہ نمایاں ہے اور اہم بھی۔ اس لحاظ سے سماج کو محض عضویہ ہی نہیں بلکہ اگر ہم اسے فوق عضویہ (Super Organism) قرار دیں تو کوئی غیر معقول بات نہیں ہوگی۔

اسپنسر اپنے مفروضے کی تشریح کرتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ہر سماج کا ایک طاقت بخشنے والا نظام ہوتا ہے، دوسرا تقسیمی اور تیسرا تنظیمی نظام جس کی مشابہت ہم کو حیاتیاتی عضویوں میں تغذیہ، دوران خون اور عصبی نظام میں دکھائی دیتی ہے۔ سماج کے طاقت بخش نظام میں اسپنسر ان تمام پیداوار صنعتوں کو داخل کرتا ہے۔ جو سماج کی زندگی کی بقا کے لیے مادی دولت پیدا کرتے ہیں۔ تقسیمی نظام میں حمل و نقل اور رسل و رسائل کے ذریعوں کا شمار کرتا ہے اور تنظیمی نظام میں گورنمنٹ کے تمام آرگن شامل ہیں جو تمام افراد کی جان اور مال کی حفاظت کرتے ہیں۔ ملک میں امن و امان قائم رکھتے اور افراد کو استحصال سے محفوظ رکھتے ہیں۔

سماجیت کے وہ مفکر کونت (Cemte) اور اسپنسر کے پیروکار تھے۔ انہوں نے ان خیالوں کو بڑے شد و مد سے تائید کی جن کی وجہ سے بعد میں بہت اعتراضات ہوئے۔

حیاتیاتی عضویوں کی مدت معین ہوتی ہے۔ پرانے زمانے سے یہ خیال چلا آرہا ہے کہ انسان کا دور حیات ستر سالہ ''Tenand Score Three'' ہے۔ انسان کی جسمانی نشو و نما

اور دماغی پختگی کا بھی تعین ہو چکا ہے۔جس طرح سے کہ اس کی اوسط عمر کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف سماجی عضویہ کے دور حیات کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔اس کی نہ تو اوسط عمر ہوتی ہے اور نہ انتہائی عمر۔

مثال کے طور پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں تعلیمی ادارے کی عمر یہ ہوگی اور اس کی انتہائی عمر یہ ہوسکتی ہے۔ برس ہا برس سے روئے زمین پر قدیم ترین تعلیمی ادارے موجود ہیں۔یہی حال مختلف مذاہب کا ہے۔مختلف حکومتوں کا ہے۔مختلف علوم وفنون کا ہے۔اس لحاظ سے سماجی اداروں کی مدت حیات معین ہوتی ہے۔

حیاتیاتی عضویوں میں خلیے (Cells) مستقل طور پر ایک جگہ رہتے ہیں جب کہ سماج کے افراد مسلسل حرکت کرتے رہتے ہیں۔وہ ایک گروہ سے دوسرے گروہ میں داخل ہوتے ہیں۔ایک سوسائٹی کو چھوڑ کر دوسری سوسائٹی میں شامل ہوتے ہیں۔جس طرح جسم میں تمام اعضاء کے لیے مختلف جگہ مقرر ہے۔سماجی اداروں میں اس طرح جگہ کا تعین ممکن نہیں۔سماج کے مختلف ادارے مختلف جگہوں پر اپنا فعل انجام دیتے رہتے ہیں۔

3۔اجتمائی شعور کا نظریہ(mid Grouptheory)

اس نظریہ کا سہرا مائکل درکائم (Durkheim Emile 1858-1917) کے سر ہے۔جو ایک فرانسیسی ماہر سماجیت تھا۔ درکائم کا نظریہ اجتماعی نیابت (Collective Representation) انفرادی نفسیات کی نفی کرتا ہے۔اس نظریہ کی رو سے یہ خیال ہی غلط ہے کہ فرد سوچتا ہے۔دراصل فرد نہیں سوچتا بلکہ اس کے خیالات، رائے، عقیدے، قدریں سب کچھ سماجی گروہ کی پیداوار ہیں۔جس میں وہ اپنی زندگی گزارتا ہے۔اسی طرح درکائم کا سسٹم سماجی جبریت (Social Determinism) کا سسٹم ہے۔جس میں فرد کی تخلیق کے لیے بالکل یا تھوڑی سی گنجائش ہے۔

اس خیال کا اظہار بڑے عمدہ طریقے سے درکائم نے اپنے مشہور مقالے "The Elementary forms of the religious life" میں کیا ہے۔ مذہب کو درکائم انفرادی

نہیں بلکہ سماجی پیداوار قرار دیتا ہے۔ مذہب کی اساس گروہ کے تجربے ہیں اور مذہبی تصورات سماجی قدروں کی علامت سے زیادہ نہیں اس لحاظ سے مذہب کا سب سے اہم فعل سماجی ہم آہنگی یا سماج و مدت کی تخلیق اور بقا ہے۔ افراد کو ایک دوسرے کے اعتبار سے انسانی سماج میں مذہب کا بہت اہم رول رہا ہے۔

اس طرح درکائم کے خیالات جو مذہب کی ابتدا اور نشو ونما سے متعلق ہیں وہ بالکل سماجی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ مذہبی زندگی ہماری سماجی زندگی کی غمازی کرتی ہے۔ وہ ہماری سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہے۔ جس میں انتہائی ناخوشگوار پہلو بھی ابھرتے ہیں۔ سماجی روایتیں انسان کی سوچ و بچار کے دائرہ کو محدود کر دیتی ہیں۔ اس لحاظ سے درکائم کے نظریہ اجتمائی، حیاتیاتی عوامل اور انفرادی نفسیاتی عوامل کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

سماجیت میں درکائم کا سب سے بڑا کارنامہ اس کا نظریہ "اجتماعی نیابت" ہے۔ درکائم کا کہنا ہے کہ گروہی فکر کے مابین عمل سے علامتیں بنتی ہیں اور ان اجتماعی علامتوں میں بڑی زبردست قوت ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کی تخلیق اور نشو ونما اجتماعی فکر کا نتیجہ ہے۔ مثال کے طور پر کسی ملک کا جھنڈا وہاں کے سیاسی، رجحانوں اور مسلکوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ مقدس تحریریں اور علامتیں مذہبی رجحانات کی عکاسی کرتی ہیں۔ سورماؤں سے جو معجزاتی قوتیں وابستہ کی جاتی ہیں وہ اجتماعی غور وفکر کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس اجتماعی نیابت میں زبردست سماجی تاثیر ہوتی ہے۔ یہ اتحاد اور تعاون کے جذبوں کو ابھارتی، تصادم اور نزاعوں کو روکتی ہیں۔ غرض درکائم کا نظریہ اجتماعی نیابت سماجی قدروں کی نشاندہی کرتا ہے۔ سماجی قدریں اجتماعی عمل کا نتیجہ ہوتی ہیں، نہ کہ انفرادی عمل کا اس لیے افراد انہیں غیر ارادی طور پر قبول کرتے جاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ درکائم کا نظریہ نیابت دراصل فرد کے ان خیالوں اور رجحانوں کو ظاہر کرنا ہے۔ جس کے لحاظ سے وہ اپنے آپ کو سماجی نمونوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس نظریہ کا لب لباب یہ ہے کہ خیالات کا وہ مجموعہ افعال و اعمال کے وہ نمونے، رجحانات اور قدریں جو کسی گروہ میں قابل قبول ہوں اور جنہیں گروہ کی تائید حاصل ہو۔ انہیں فرد اس طرح اپناتا ہے کہ وہ اس کی سماجی زندگی کا جزو بن جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے شخصیت کی تشکیل میں سماجی دباؤ کا زبردست

رول ہوتا ہے۔غرض درکائم دوسرے یورپی ماہر سماجیت کی طرح اس خیال پر زور دیتا ہے کہ "The social the at reflection microscopic a but soul individual world" یعنی "انفرادی روح سماجی دنیا کا ایک خوردبینی عکس ہے۔" درکائم کے اس نظریے پر انفرادی نفسیات کے حامی مفکرین نے کافی تنقید کی ہے۔ان کا خیال ہے کہ اس نظریے میں یہ خامی پائی جاتی ہے کہ وہ انفرادی قوتوں اور انفرادی فکر اور سوچ و بچار کی نوعیت پانی کے قطروں یا بادلوں کی طرح نہیں ہوتی جو ایک دوسرے میں خم ہو جاتے ہیں۔

اگر افراد واقعی سماجی دنیا کا عکس ہے تو ہم سب کو ایک دوسرے کی کاپی ہونا چاہیے اور موجودہ نسل کو گذشتہ نسلوں کی ہو بہو عکاسی کرنی چاہیے۔ان میں کوئی تبدیلی، کوئی ترقی نظر نہیں آنی چاہیے۔اس لحاظ سے ہمارے سماجی ادارے بالکل آدمی باسیوں کی طرح ہونا چاہیے۔چونکہ افراد میں انفرادی طور پر سوچنے، سمجھنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔اس لیے سماجی اداروں کا تقابلی مطالعہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ وقفہ وقفہ سے ان اداروں کی ساخت اور فعل سے تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

جدید اردو شاعری اور سماجی کشمکش:

انسانوں کے ابتدائی شعور سے لے کر اس وقت تک ان کے احساس، وجدان، ذوق اور نقطہ نظر میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں۔وہ اس جدوجہد کی کہانی ہیں جو سماج کی بڑھتی ہوئی اور پھیلتی ہوئی ضرورتوں میں توازن پیدا کرنے کے لیے انسانوں نے کی ہیں۔یہ کوئی مابعد الطبیعاتی یا خیالی بات نہیں ہے۔بلکہ مادی کشمکش نے جس طرح اس کے شعور کو تشکیل دیا ہے یا سماجی حالات پیدا کیے ہیں اس کی تاریخ ہے۔

انسان اپنی ترقی کی رفتار میں جس جگہ ایک دفعہ پہنچ جاتا ہے، ٹھیک اس جگہ پھر نہیں پہنچتا۔جو نظریے عزیز ہوتے ہیں، وہ بدل جاتے ہیں۔جو باتیں ایک وقت میں تسکین کا باعث ہوتی ہیں دوسرے وقت میں وہی تکلیف دہ بن جاتی ہیں۔سائنس، آرٹ، مذہبی تصورات اور جنسی تعلقات سب میں پیداوار کی تقسیم کے بدلتے ہوئے تناسب نے فرق ڈال دیا ہے۔سوسائٹی طبقوں میں تقسیم ہوتی رہی اور ان کی معرکہ آرائیوں میں ادب اور علم زیادہ تر طاقت ور طبقوں کی ملکیت بنے

رہے۔ انھیں کے جذبات کی ترجمانی کرتے رہے اور انھیں کی حمایت۔ یہ بات بھی کسی قدر یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ایسا کسی سازش کے تحت نہیں ہوا بلکہ بادشاہوں اور امیروں نے آرٹ کی سرپرستی کر کے تقریباً غیر شعوری طور پر اپنے طبقے میں آرٹ پیدا کرنے میں مدد دی مگر اس کے ساتھ ساتھ ادب اور دوسرے فنون لطیفہ کا اچھا خاصا ذخیرہ بھی آنے والی نسلوں کے لیے مہیا ہو گیا۔ جس میں آسانی سے مختلف ادوار کے فلسفہ حیات کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

اردو شاعروں کی پیدائش اور ترقی کا زمانہ شاہی نظام کے زوال، صوفیانہ خیالات کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس لیے اس کے اندر وہ سب باتیں آ گئیں جن میں زندگی سے مقابلہ اور کسی نصب العین کے لیے اٹھ کھڑے ہونے اور جدوجہد کرنے کی تاب نہیں ہے۔ آج البتہ اردو ادب بڑی بڑی تبدیلیوں سے ہم آغوش ہے۔ زندگی کی وہ ساری معاشی، معاشرتی اور جنسی کشمکش جو غیر ملکی حکومت اور طبقاتی تاراجی کی وجہ سے پیدا ہوسکتی ہے۔ اس سے اردو شاعری مقابلہ کر رہی ہے اور صحیح راستہ دکھا رہی ہے جس میں ادب کو آسانی سے بڑھنے اور سانس لینے کا موقع مل سکے۔ گو قدیم روایات اور اخلاقی قدروں کے اثرات اب بھی تمدن کا اہم جزو بنے ہوئے ہیں۔ اس لیے کہ "حال" میں "ماضی" بھی موجود ہے۔ یہ تبدیلیاں کیسے ہوئیں، قوموں کی تاریخ اقتصادی کشمکش کی وجہ سے ایسی جگہ پہنچ جاتی ہے۔ جہاں اس میں نئے نشانات دکھائی دینے لگتے ہیں۔ ایک تصور حیات کچھ دنوں تک نیا رہنے کے بعد پرانا ہو جاتا ہے اور بار بار کے تصادم سے اس میں نئے زاویے پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ موقعے تو ہر وقت آتے رہتے ہیں۔ جن میں تبدیلی ہو سکے لیکن جب کوئی نظام اپنے پھیلنے اور بڑھنے کی طاقت کھو دیتا ہے اور مخالف عناصر رکھنے والوں کو اپنے یہاں جگہ نہیں دے سکتا، اس وقت تاریخ انقلاب کے دور سے گزرتی ہے اور نئی قدریں بہت واضح ہو جاتی ہیں اب تک کوئی نظام ایسا نہیں بن سکا اور نہ ہی موجودہ حالات میں بن سکتا ہے۔ جس میں ایک طبقے کو دوسرے طبقے کی لوٹ سے روکا جائے۔ اس لئے لوٹے جانے والے طبقے کی زندگی نظام معاشرت کی ٹھیک طور سے چلنے میں روڑے کا کام کرتی ہے جو حقیقت شروع میں آہستہ آہستہ چنگاری کی طرح سلگتی رہتی ہے، وہ کچھ دنوں کے بعد تنظیم کی مدد سے طاقت پیدا کر کے ایک زبردست شعلہ بن جاتی ہے، جس میں پرانی چیزیں اور قدریں اس طرح جل جاتی ہیں کہ کام کی

چیزیں تپ کر اور نکھر آتی ہیں اور اس راکھ کے ڈھیر سے نئی زندگی پیدا ہو جاتی ہے یہ سب کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ جو لوگ تاریخ کی پر پیچ راہ سے واقف ہیں بتا سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ معمولی سوجھ بوجھ کے نقاد تو ادب اور شاعری کی لطافت میں کھو جائیں گے لیکن سماج کے بڑھنے اور پھیلنے کی منطق کو سمجھنے والے ان اصولوں کو سمجھ لیں گے جو ان اصولوں کی تہہ میں ہیں۔

1857ء کے انقلاب کے بعد سے ہندوستان کی معاشی حالت میں بڑی تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور ان تبدیلیوں نے لوگوں کے احساسات پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ ہمارے طبقاتی شعور کو بیدار کر کے ہمیں جدوجہد میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا۔ جن میں تمام دنیا کے لوگ جو اسی حالت میں ہم شریک اور ہم نفس دکھائی دیے۔ غدر کوئی ارتقائی انقلاب نہ تھا۔ پوری اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ہندوستان کے لوگوں کے دل میں جو شعلہ پھوٹ رہا تھا، وہ پھوٹ گیا۔ چنگاری شعلہ بن کر بھڑک اٹھی۔ اگرچہ وہ آگ بجھا دی گئی لیکن اس نے جو گرمی اور روشنی دکھائی تھی۔ اس میں بہت سے تصورات اور خیالات کی عمارتیں کھڑی ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ انحطاطی دور ہمیں اس احساس اور شعور کے سوا کچھ دے بھی نہ سکتا تھا۔ غدر میں جو لوگ بچ گئے انھوں نے بڑے واقعے کو نئی زندگی کا نقطہ آغاز بنا لیا اور اس کے بعد بہت سی تحریکیں سامنے آ گئیں۔ چونکہ ظاہری اور مادی طور پر ہندوستان کو شکست ہوئی تھی۔ اسلحے چھین لیے گئے۔ غیر ملکی حکومت کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔ اس لیے ایک طرح کی مایوس کن، شکست خوردہ ذہنیت پیدا ہو گئی اور نتیجے کے طور پر اس سے نکلنے کے لیے اصلاح پسندی کی شاہراہ پر لگا دیا اگر کہیں دہلی کی تباہی، لکھنو کی بربادی اور پرانے حالات کے بدل جانے پر آنسو بہائے گئے، علامت اور استعارات کی شکل میں تباہی پر تبصرہ کیا گیا یا پھر خاموشی اختیار کی گئی۔

غدر کی تاریخی اہمیت کو مان لینا اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ وہاں سے ایک سنگ میل مان کر آگے بڑھا جا سکے اور تاریخ کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کیا جا سکے۔ کبھی کبھی اس طرح تقسیم کر لینا غلط بھی ہوتا ہے لیکن سوچنے اور جانچنے کے نئے طریقوں نے سکھایا کہ ایسے بڑے واقعات سے کچھ نئی باتیں شروع بھی ہو جاتی ہیں۔ ایسے ایسے معرکوں میں بہت سی پرانی باتیں مٹ جاتی ہیں اور بہت سی نئی روایتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اگر کسی ملک کی اقتصادی حالت نہ بدلے تو تبدیلی کوئی معنی ہی نہیں

رکھتی۔اور اقتصادی حالت نہ بدلنے پر پورے سماج کا ڈھانچہ طبقات کے تعلقات کے اور سوچ بچار کے راستے بدل جاتے ہیں۔ یہ سب باتیں ایک دوسرے سے اس طرح ملی ہوئی ہیں کہ ایک کو سمجھے بغیر دوسری اچھی طرح سمجھ نہ آ سکے گی۔

نئی ہونے والی باتوں کے اثرات پہلے ہی شروع ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ بھی پرانی ہی باتوں کے پیٹ سے پیدا ہوتی ہیں دو چار سوچ سمجھ رکھنے والے انہیں دیکھتے، سمجھتے ہیں اور ان کے بارے میں لکھتے ہیں مگر اسی زمانے میں ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو حالات کے بدلنے کا اثر نہیں لیتے اور تغیرات کے بعد بھی اپنے خیالات کو بدلنا نہیں چاہتے۔عذر کے پہلے ہی انگریزی تعلیم ہندوستان کے بعض حصوں میں پھیل چکی تھی۔ اخبار نکل رہے تھے۔ نئے علوم سے واقفیت بڑھ رہی تھی۔اس کے اثر سے فضا میں ہلکی ہلکی لہریں فضائیں اٹھ کر ہندوستان میں کئی طرح کی آوازیں گونج رہی تھیں۔اور پرانے ہندوستان کی آواز دم توڑ رہی تھی۔شعور بڑھتا جا رہا تھا اور پرانے ہندوستان کی آواز جو نئی طاقتوں سے مقابلہ کرنے پر آمادہ تھی اور اب تک مختلف سماجی اور مذہبی خیالات کی آڑ لے کر مقابلے پر آمادہ نظر آئی تھی گو وہ تنزل کا پرچم بلند کر رہی تھی۔لیکن ہندوستان کی ترقی کی سست چال کی وجہ سے اب بھی بہت سے لوگوں کے لیے تسکین کا سامان رکھتی تھی۔

انگریزی تعلیم نے چاہے کچھ اور دیا نہ ہو چاہے میکالے کا مقصد اس سے پورا ہو یا نہ ہو لیکن یہ ضرور ہوا ہے کہ مشرق کی داخلیت، روحانیت، انفرادیت اور سکون کی تلاش، تصورات اور مایا جال کے پجاریوں کے چوٹ سی لگی اور سوچنے سمجھنے کا طریقہ بدل گیا۔آنکھیں کھل گئیں اور جاگیر داری کے سوکھتے ہوئے تناور درخت کے سائے میں ایک نئے متوسط طبقے کا پودا پیدا ہو کر پنپتا اور بڑھتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ یہ طبقہ ہر بات کو کچھ نئی طرح سے دیکھنا چاہتا تھا۔کلاسیکل تعلیم کی طرف سے لوگوں کا دل ہٹنے لگا۔ نئے حالات نے سب سے پہلے بنگال پر اثر کیا تھا۔اس لیے وہاں ایک طرح کا نشاۃ ثانیہ ہوا جس کے لیڈر یہی انگریزی تعلیم پائے ہوئے لوگ تھے۔ راجہ رام موہن، رائے مہرشی ٹیگور اور کیشپ چندر سبن کے نام اس سلسلے میں ضرور آتے ہیں۔مسلمانوں کے یہاں بھی مذہبی اصلاح کا زور شروع ہو گیا تھا اس کی باگ ڈور بالکل دوسرے قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ لوگ نئی تعلیم سے متاثر نہ تھے۔ان میں مولانا سید احمد بریلوی، شاہ عبدالعزیز محدث

دہلوی، مولانا کرامت علی کے نام قابل ذکر ہیں۔

مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی اصلاح کا وہ دوسرا دور تھا جس کی رہبری سرسید احمد خاں نے کی اور جو اس نئی کشمکش اور نئی تعلیم کے نتیجے کے طور پر تھی۔ یہاں پہنچ کر اصلاحی تحریک کا دائرہ بڑھ جاتا ہے اور اس میں مذہب، معاشرت، تعلیم اور ادب وغیرہ سب سما جاتے ہیں۔ پہلی تحریک ادبی حیثیت سے اتنی اہم نہیں جتنی دوسری ہے۔

غدر سے پہلے اور غدر کے بعد بھی یہ طبقاتی سماجی کشمکش کا ترجمان رہا۔ اس میں اردو جاننے والوں اور اردو زبان کے ذریعے اپنے خیال ظاہر کرنے والوں میں سرسید، ذکاءاللہ، نذیر احمد، حالی، آزاد، چراغ علی، محسن الملک، وقار الملک وغیرہ شامل تھے۔ غدر سے پہلے اور غدر کے بعد ہندوستانی سماج میں نئے اثر دکھائی دینے لگے جس کی ترجمانی ادب کو کرنا پڑی۔ فرضی غم عشق نے حقیقی غم راز کو جگہ دے دی اور تصوف میں تسکین کا کوئی پہلو نہ رہا۔ پہلے داستانیں جھوٹ معلوم ہوتے ہوئے بھی مزا دیتی تھیں۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ انسانی زندگی میں بھی کافی پیچیدگیاں ہیں۔ انفرادی زندگی، خاندانی زندگی اور پھر معاشرتی زندگی اتنی الجھی ہوئی ہے کہ اس بیان میں بھی مزا آسکتا ہے۔

شاعری نے آزاد، حالی اور اسمٰعیل پیدا کیے تو کہانیوں نے نذیر احمد اور سرشار کے یہاں جنم لیا۔ شاعروں کے تذکرے جو اس وقت تک تنقید کا سب سے اعلیٰ ذخیرہ سمجھے جاتے تھے آب حیات اور مقدمہ شعر و شاعری میں بدل گئے۔ مذہبی، اخلاقی اور صوفیانہ مضامین جن کی بنیاد عقل سے زیادہ نقل پر اور سوچ سمجھ کر نتیجہ نکالنے سے زیادہ روایت پر ہوتی تھی۔

جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے۔ اس میں اصلاح پسندی کا خیال درحقیقت حالات نے پیدا کیا تھا۔ مگر شاعری کا نیا ڈھنگ زیادہ تر مغرب سے مانگا ہوا تھا۔ نثر میں البتہ صرف نقل نہیں معلوم ہوتی بلکہ جو چیزیں انگریزی سے بھی لی گئی ہیں۔ وہ ہندوستانی بنالی گئیں۔ آزاد کی آب حیات کا خاکہ چاہے جانسن کی ''posts Of Living'' سے ملتا جلتا ہو۔ لیکن اس کا حرف حرف ہندوستانی انداز بیان، رنگینی اور ہندوستانی سماج کے نقشوں سے جھلک رہا ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری چاہے ورڈ زورتھ اور شبلی کے Lyrical of Peface and poetry of "defense Ballads" سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہو لیکن اردو شاعری کا بہت اعلیٰ تجزیہ ہے۔

یہ کچھ اتفاق نہ تھا کہ ہر طرح کے مضامین میں، چاہے وہ نثر کے ہوں یا نظم کے ایک طرح کی یکسانیت ہے بلکہ نئے حالات اور اثرات کام کر رہے تھے اور اس وقت ایسے ہی اصلاحی ادب کا پیدا ہونا ممکن تھا۔ حالات کے ایسے بدل جانے کے بعد بھی بہت سے ایسے شاعر اور ادیب تھے جو نئی زندگی اور نئی بیداری سے متاثر نہ تھے کیونکہ ان کے معاشی تعلقات نہیں بدلے تھے۔ اگر داغؔ اور امیرؔ جلالؔ اور اسیرؔ پرانے جاگیر دارانہ نظام کے پروردہ تھے۔ تو آزادؔ اور حالیؔ متوسط طبقے کے، جو مغرب کے علوم وفنون سے متاثر ہو رہا تھا۔ 1857ء اور 1880ء کے بیچ میں ہندوستانی ادب ایک انوکھی ترقی کے دور سے گزرا۔ میر انیسؔ (جن کا انتقال 1874 میں ہوا) اور مرزا دبیر (جو 1875ء تک زندہ رہے) مرثیے کے راستے سے اردو میں ایک نئی طرح کی وسعت لائے تھے۔ انہوں نے یکا یک اردو زبان کے سرمائے میں جدید انداز بیان اور نئے تصورات کا اضافہ کر دیا۔ جو مواد اور ترقی دونوں میں ترقی کی راہ دکھاتے تھے۔

دلی میں غالب تھے جن کی غزلوں کے بعض شعر زندگی کے نئے شعور کا پتہ دیتے ہیں۔ جنہوں نے پہلی دفعہ یہ محسوس کیا کہ کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے اور اسی خیال کو پھیلا کر آزادؔ اور حالیؔ نے دبے لفظوں میں غزل کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ اس بات کو اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ پہلے بھی ادب اور شاعری کا کچھ مقصد ہوتا تھا۔ مگر وہ خود لکھنے والوں کو اچھی طرح معلوم نہ تھا اور اب بھی لکھنے والوں کے سامنے ان کا مقصد تھا اور وہ اپنے مقصد سے باخبر ہو کر لکھ رہے تھے۔ اپنے مقصد کا شعور رکھ کر کوئی بات کہنا اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ جو صرف نقالی کے طور پر کہی جاتی ہے۔ شعور کی رفتار خط مستقیم میں ہوتی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اس لیے یہ بتانا کہ غدر کا کتنا اثر ہے اور نئے نظام کا کتنا، انگریزی تعلیم کا کتنا اور نئے معاشی تعلقات کا کتنا، کسی کے امکان میں نہیں ہے کیونکہ سب کچھ ایک ہی میں گتھا ہوا ہے۔ حالات کے بدل جانے اور ادب میں نئی لہروں کے پیدا ہونے کا سہرا کسی مخصوص تفسیر کے سر یقیناً نہیں رکھا جا سکتا۔ لیکن غدر میں جس تخریب اور تعمیر کا پتا چلتا ہے وہ زندگی کے دھارے کو موڑ دینے کے لیے کافی ہے۔

غدر نہ ہوتا تو انگریزی طاقت کے اقتدار کا اتنا یقینی طور پر مان لینا ممکن نہ ہوتا جتنا کہ اس وقت کے لکھنے والوں کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔ ان لوگوں نے جمود اور یکسانیت کے اس قلعے کو توڑ

دیا جو مدت سے شعر و ادب کو قید کیے ہوئے تھا اور اردو ادب میں تبدیلی کی ایک نئی روایت شروع ہو گئی جو بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے رہی تھی۔

حب الوطنی کے جذبات اور قومی ضروریات نے حاکم و محکوم کی کشمکش بڑھا دی تھی اور زندگی کے ہر شعبے میں اس کے اثرات نمایاں ہو گئے تھے۔ بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی ذرائع آمد و رفت میں ترقی ہوئی تھی۔ متوسط طبقے نے حکومت کا بوجھ اپنے کندھوں پر کسی قدر اٹھا لیا تھا۔ اور انہیں اس کا احساس ہو رہا تھا کہ ان کی اولاد کو حقوق ملنے چاہیئں۔ اکبر الہٰ آبادی، شاد عظیم آبادی اور چکبست، سب متوسط طبقے کے ترجمان ہیں۔ اکبر کو مغربی تہذیب سے نفرت تھی۔ لیکن جس طرح اکبر نے سیاسی حالات کو سمجھا تھا اس طرح کم لوگ سمجھتے ہیں۔ انہوں نے سماجی مسائل کو اپنی شاعری کا جزو بنایا۔ اس طرح کوئی شاعر نہ بنا سکا۔ وہ عوامی شاعر کہلائے۔ انہوں نے عوام کی زبان بولی اور سماجی مسائل پر نظمیں کہیں۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے اردو کے نوجوان شاعروں کی راہ میں بہت سے چراغ جلا دیے۔ انہیں انگریزی شاعری کی روکھی پھیکی تقلید سے نجات دلا کر نئی وسعتوں سے آشنا کیا۔

سماجی کشمکش سے پیدا ہونے والے ادب کا جتنا ذخیرہ اردو ادب میں فراہم ہو گیا ہے۔ اتنا شائد ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں نہیں ہے۔ اگر صرف ایسے شاعروں کا نام لیا جائے جو انقلاب کی دھمک اپنے سینے میں محسوس کر رہے تھے تو ان کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ جیسے جوشؔ، احسانؔ، ساغرؔ، سیمابؔ، مجازؔ، الطافؔ، سردارؔ جعفری، جوادؔ زیدی، سلامؔ، اخترؔ، جذبیؔ، مطلبیؔ، شمیمؔ کریانویؔ، کیفیؔ، ن م راشدؔ، مخدومؔ، راشدؔ، ملاؔ، جمالؔ، تاثیرؔ، فیضؔ، یہ وہ نام ہیں جو جدید اردو شاعری کا ذکر کرتے وقت نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ ان لوگوں نے شاعری کو سماجی زندگی کے اظہار کا ایک ذریعہ قرار دیا ہے اور اسے زندگی کے اور روابط کی مدد سے سمجھا ہے۔

اس وقت جنگ سب سے بڑی حقیقت ہے اس وقت انسانیت ایک خوفناک جنگ میں مبتلا ہے۔ جس نے ساری دنیا کے ادیبوں اور شاعروں کے سامنے نئے حقائق پیش کر دیئے ہیں۔ کسی ملک نے خود غرضی سے جنگ میں شرکت کی ہے۔ کسی کو مجبوراً حفاظت خود اختیاری کے طور پر شریک ہونا پڑا اور کسی کو سامراج کی جڑوں کو مضبوط بنانے کی خاطر ہتھیار اٹھانے پڑے۔ وہ شعرا جو

زندگی کے تغیرات کے ساتھ ساتھ شاعری میں تغیرات کو نہیں مانتے انہیں جنگ پر غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو شاعری اس کشمکش کو نہ سمجھے گی اس کا مستقبل بہت اچھا نہیں ہوسکتا۔ اگر چہ شاعری پیغمبری کا جزو ہے اور شاعر میر کارواں بننا چاہتا ہے تو اقبال کی زبان میں اسے یہ یاد رکھنا چاہیے۔

نگہ بلند سخن دل نواز، جاں پر سوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

بغیر اعلیٰ نصب العین، فنی حسن کاری اور خلوص کے شاعری زندہ نہ رہے تو تعجب نہ کرنا چاہیے۔

سماج فہمی

سماج فہمی سے مراد معاشرتی اور سماجی فہم و ادراک کا شعور رکھنا ہے۔ معاشرتی یا سماجی شعور سے مراد سماجی مسائل سے آگاہی اور اس فہم فراست کا استعمال کرتے ہوئے ان مسائل و مصائب کا بیان ہے جو کسی سماج کو درپیش ہوتی ہیں۔ سماج اپنے حصے کے لیے ایک صفت ہے جو معاشرے سے منسلک ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ سماج یا سوسائٹی ایک ایسی جماعت ہے جو ایک دوسرے سے باہمی رابطے کرتی ہے اور جو ایک مشترکہ ثقافت رکھتے ہیں۔

لہٰذا معاشرتی مسائل وہ حالات ہیں۔ جو کسی برادری یا اس کے کسی ایک شعبے کی ترقی یا پیش رفت کو روکتے ہیں چونکہ یہ عوامی مسائل ہیں۔ لہٰذا ان مسائل کے حوالے سے ریاست کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ حکومتی اقدامات کے ذریعے ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرے بلکہ اس بات کو یقینی بنائے کہ وہ عوام کے مسائل کا یقیناً حل تلاش کرے تا کہ سماج کے لوگ آسودہ زندگی گزارنے کے متحمل ہوسکیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر یہ اس کے والدین ہیں جو
اسے یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔ (بخاری)"

انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو بہت ساری مثالیں ایسی ہیں جس سے یہ تصدیق ہو جاتی ہے کہ اس کے اندر عقل، شعور اور ادراک ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر انسان کی فطرت محبت ہے۔ نفرت باہر سے اس میں آتی ہے۔ انسان جب اندر سے برابر ہوتا ہے تو باہر بھی اس کا فوکس برابر ہی ہو جاتا ہے کیونکہ اس تمام کائنات کی بنیاد ہی انسان ہے۔

اگر وہ ہی باصلاحیت نہیں تو وہ اس کائنات کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں کر پائے گا اور اگر وہ انسان، وہی انسان ہے جو فطرت سلیمہ والا ہے۔ تب یہ کائنات کا مرکز بن جائے گا۔ جیسے ہی وہ اس کائنات کے ساتھ برابر ہوگا۔ اس پر راز کھلنا شروع ہو جائیں گے۔ انسان اس کائنات کے ساتھ تبھی برابر ہوتا ہے۔ جب وہ خود اپنی ذات میں برابر ہو جائے گا۔ تب کائنات بھی اس کے سامنے کھل جاتی ہے۔

ازل سے لے کر آج تک انسان کا سب سے بڑا مسئلہ وہ سماجی تخلیقات (Social Creates) ہیں۔ مثال کے طور پر دریا تو دریا ہے لیکن اگر کوئی اس دریا کو بھگوان کا درجہ دے دے، اسے دیوتا کہے، اسے انسانوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے والا کہے تو کوئی کیا کہہ سکتا ہے لیکن انسان کے اپنے تجرباتی علم نے دریاؤں کی طغیانی کو زیر کر لیا ہوا ہے۔ ان کے راستوں پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ اب اگر کوئی معاشرہ اس تجرباتی علم سے فائدہ نہیں اٹھاتا تو اس کی مرضی یا تو وہ بھگوان ہی سمجھتا رہے۔ معاشرے میں کیوں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ

☆ "ماں" اپنی اولاد کے بغیر دوسرے بچے سے محبت نہیں کر سکتی؟

☆ چاند گرہن میں کیوں سکون سے نہیں بیٹھ سکتی؟

یہ سب سماجی تخلیقات ہیں جبکہ ہمیں حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے یہی وہ کائنات اور انسان کے درمیان فکری تصادم ہے۔ جس کے باعث شعور، ادراک اور عقل پر پابندیاں بھی لگا دی جاتی ہیں اور کہیں آزاد کر دیتی ہیں۔ یہیں سے انسان کا تجرباتی علم اسے زندگی کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کی راہ دکھاتا ہے اور اسے ''Out of the box'' سوچنے کی قوت فراہم کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان جب تک مادے کے ساتھ اپنے باطن سے نہیں جڑے گا تب تک اسے خود سمجھ میں نہیں آئے گا۔ انسان نیچر سے جڑتا ہے۔ تو نہ صرف نیچر کو مسخر کر کے اسے کھولتا

ہے بلکہ انسان کی اپنی صلاحیتیں بھی اس پر آشکار ہوتی ہیں۔ انسان جیسا ماحول بنائے گا، اس کا بچہ ویسا ہی پروان چڑھے گا۔ بچہ اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کا شعور لے کر ہی پیدا ہوتا ہے۔ ہم فطرت سے الگ نہیں ہو سکتے، انسان مادے سے نیچر تک نبرد آزما ہے اور اپنے تجرباتی علم سے کبھی ہواؤں کو مسخر کر رہا ہے تو کبھی پانی کو۔ انسان نے نیچر (nature) سے ہی اپنی بقا کا سامان پیدا کر لیا۔ ضروریات پوری کی، سہولیات لیں، یہاں تک کہ آسائشات سے زندگی گزار رہا ہے۔ شاعری، عمومی اور تجدیدی انداز میں الفاظ کی علامتوں کے ذریعے اس نامیاتی رشتے کا اظہار کرتی ہے۔ جوانا اور بیرونی حقیقت کے عناصر کے درمیان ہوتا ہے۔ یہی تعمیم فی الحقیقت اس کی قابلیت کا مخرج ہے، جس سے وہ اچھوتی قوت کے ساتھ انسان کے "جبلی جذباتی" عنصر کا اظہار کرتی ہے، یعنی سماج انا کا طبعی حصہ، سماجی مسائل میں غربت وافلاس، شعبہ صحت، تعلیم، خوراک اور رہائش وغیرہ کے مسائل سرفہرست ہیں۔

اس سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ معاشرتی مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے۔ جب بہت سے لوگ اپنی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ آبادی کا ایک شعبہ صحت کی خدمات، تعلیم خوراک یا رہائش تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر ہے۔ یہ ایک گھمبیر معاشرتی مسئلہ ہے۔

اگرچہ معاشرتی مسائل کے بغیر کوئی ملک نہیں ہے لیکن قومی حقیقت میں ان کی سب سے چھوٹی تعداد ترقی کا اشارہ ہے۔ آبادی کی زندگی میں معاشرتی پریشانیوں کے واقعات جتنے کم ہوں گے۔ اتنی ہی ترقی ہوگی اکیسویں صدی کے سب سے زیادہ پریشان کن معاشرتی مسائل میں سر فہرست غربت ہے۔

جو دنیا بھر میں ایک عرب سے زیادہ لوگوں کو متاثر کرتی ہے لیکن یہ بات ضروری نہیں ہے کہ دوسرے وسائل کے علاوہ رہائش، صحت، پینے کے پانی اور تعلیم تک رسائی کم از کم ضروری حصول کے بغیر، زندہ رہنے کے لیے کم سے کم ضروری ہونے کے بغیر، حد سے زیادہ حد تک محرومیوں کے بارے میں نہیں۔ ہر انسان کی ترقی کے لیے غربت کی ایک وجہ کام کا فقدان ہے۔

غربت اس صدی کی ایک اور انتہائی خطرناک معاشرتی مسائل کے ساتھ کام کر رہی ہے

"بھوک" یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ غذائیت کی وجہ سے ہر سال اموات کی سب سے زیادہ تعداد ہوتی ہے جو کہ خاص طور پر دنیا کی آبادی کا 10 فیصد ہے اور یہ کہ بھوک کی وجہ بھی معلومات اور تعلیم کا فقدان ہے جس کی وجہ ثقافتی سطح کم ہے۔ دوئم سب سے قدیم معاشرتی مسائل "جنسی اور نسلی امتیاز ہے" جو بالترتیب مرد کے جنس اور بالترتیب عورت پر نام نہاد سفید فام نسل اور دیگر نسلوں سے بالاتر ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ سرگرمی اور عوامی بیداری کے ذریعے ان مسائل کو ختم کرنے کے لیے لاکھوں افراد کی جدوجہد کے باوجود یہ بدستور ہے اور تکلیف، تشدد اور بچوں کے ساتھ بدسلوکی کا ذکر کیے بغیر ہم معاشرتی مسائل کے بارے میں کیسے بات کر سکتے ہیں۔

ایک ایسا ظلم جو صرف ہماری نسلوں میں ہوتا ہے، متعدد بار اس کا آغاز نچلے طبقے کے بچوں کے لیے کام کرنے کی ضرورت کے نتیجے میں ہوتا ہے اور ان کا استعمال کرنے والے ان لوگوں کا استحصال کرتے ہیں جو ان کا استحصال کرتے ہیں۔ جو انتہائی گھٹیا انداز میں تصوراتی، جیسے بچوں کے جسم فروشی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

یہ تمام معاشرتی مسائل آپس میں جڑے ہوئے ہیں لہٰذا ان کو الگ تھلگ نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستانی سماج اعلیٰ و ادنیٰ اور ذات پات کی تفریق کے سبب مختلف طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ اس سماج میں عزت و احترام کا معیار دولت تھا۔ کوئی شخص جتنا زیادہ دولت مند ہوتا اسے اتنا ہی محترم سمجھا جاتا اور اس کا شمار اعلیٰ طبقے میں ہونے لگتا۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو اقتصادی طور پر کمزور تھے۔ خواہ وہ کسی بھی مذہب کے پیروکار ہوتے انہیں نچلے طبقے کا آدمی سمجھا جاتا۔ اس بات کا نتیجہ یہ نکلا کہ اعلیٰ طبقے سے وابستہ لوگ سماج میں اہمیت کے حامل ٹھہرے اور محنت مشقت کر کے روزی پوری کرنے والے مزدوروں، کسانوں اور غریب غرباء کو نچلے طبقے کا نمائندہ سمجھا جانے لگا اعلیٰ طبقے کے افراد دولت کے بل بوتے پر سماج کے کرتا دھرتا اور چوہدری بنتے گئے۔

اس خود ساختہ سماجی تقسیم کی وجہ سے سماجی ناہمواری نے جنم لیا۔ چھوت چھات اور اعلیٰ و ادنیٰ کے درمیان خلیج حائل ہوتا گیا مختلف حملہ آوروں کے حملوں کے سبب نسلی امتیازات کا سلسلہ شروع ہوا فاتح اور مفتوح کی صورت ایک نئی گروہ بندی سامنے آئی۔ جونہی وقت گزرتا گیا برصغیر کے باسیوں

کے درمیان یہ تقسیم مختلف طبقات کی شکل اختیار کرتی گئی۔ انیسویں صدی کے شروع ہونے تک دو واضح طبقات اونچا طبقہ اشرافیہ کی صورت میں اور کسان مزدور نچلے طبقے کی صورت میں تقسیم ہو کر سامنے آ چکے تھے۔ یہ طبقات کبھی راجواڑوں اور رعایا کی شکل میں سامنے آئے تو کبھی بادشاہ عوام کی صورت میں۔ کبھی یہ جاگیر دار اور کسان کی صورت میں دیکھے گئے تو کبھی سرمایہ دار اور مزدور کی صورت میں ان کا وجود ظاہر ہوا اور ان تمام صورتوں میں ایک استحصالی رویہ سامنے آیا۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد ایک تیسرا طبقہ متوسط طبقہ کے نام سے متعارف ہوا۔ جو بیسویں صدی کے اوائل تک اپنی تمام اقدار وضع کر چکا تھا۔

یہ طبقہ مشکلات کا سامنا کرتے زندگی کے دن پورے کر لیتے۔ انہیں مندروں میں جانے کی اجازت نہ تھی اور ایسا کرنے پر سخت سزا کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ہندوستانی سماج میں دوسری شادی کو گناہ سمجھا جاتا تھا۔ خاوند کے مرنے پر بیوی کو بھی اس کے ساتھ جلا دیا جاتا تھا۔ یہ رسم "ستی" کہلاتی تھی۔ اس طرح ہندوستانی معاشرہ تہذیبی جبر کا شکار رہا۔ اس طبقاتی کشمکش اور سماجی اونچ نیچ کے اثرات برصغیر کے ادب پر بھی مرتب ہوئے۔ کبھی شعوری اور کبھی لاشعوری شکل میں۔

ادب میں ہونے والی ان تبدیلیوں سے اردو شاعری بھی متاثر ہوئی۔ 1857ء کی جنگ آزادی کا تعلق بظاہر سماج اور سیاست سے تھا۔ مگر اس کے اثرات سے تمام شعبہ ہائے زندگی متاثر ہوئے۔ ادب اور سماج کا گہرا تعلق ہے۔ شاعر کو معاشرے کا اچھا عکاس کہا گیا ہے۔ کیونکہ وہ جو دیکھتا ہے محسوس کرتا ہے۔ اسے شاعری کی صورت میں اپنے کلام سخن کے ذریعے پیش کرتا ہے معاشرے کا یہ حساس طبقہ سماج اور اس کے نشیب و فراز سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اس لیے سماجی اتار چڑھاؤ کی جھلک ادب میں بھی نظر آتی ہے۔

1857ء کے حالات نے ہندوستان کے لوگوں کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کو بڑا متاثر کیا۔ ادیبوں اور شاعروں نے ان حالات اور مظالم سے متاثر ہو کر قومیت، آزادی، مساوات اور قومی یکجہتی کا پیغام قوم تک پہنچانے کی ذمہ داری اٹھالی۔ ادب نے براہ راست زندگی اور اس کے مسائل سے متاثر ہونے کے بعد ایسی سمت اختیار کر لی جو آگے چل کا سماج کی بہتری اور ترقی کا باعث بنی۔

جنگ آزادی کے بعد رونما ہونے والے حادثات کے نتیجے میں لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہونے لگا۔ اکبر اور اقبال نے بھی اپنے اپنے دور میں اس بنیادی مسئلے کو اپنے فکر و شعر کا موضوع خاص بنایا۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک نے قدرے ظرافت کا لبادہ اوڑھا اور دوسرے نے فکر کے لبادے میں اپنے خیالات کو پیش کیا۔

نظیر اکبر آبادی ایک عوامی شاعر تھے۔ ان کا انداز بیان بھی عوامی ہے۔ وہ سادگی و سلاست کے قائل تھے اور انہوں نے تقریباً ہر عوامی موضوع پر نظم لکھی ہے۔ ان کی نظموں کے نام ملاحظہ ہوں! شب برات، دیوالی، ہولی، جاڑا، برسات کی بہاریں، بسنت، آٹا دال، روٹی، کوڑی، پیشہ، روپیہ وغیرہ، مذہبی رواداری نظیر کے کلام میں بدرجہ اُتم موجود ہے۔ بقول احتشام حسین:

> "نظیر نے دربار سے علیحدہ ہو کر عوام سے رشتہ جوڑا اُن سے پہلے یا ان کے بعد کا کوئی شاعر ایسا نہیں ملتا جن سے ہم ان کا مقابلہ کریں۔"(2)

نظیر اکبر آبادی کو حیرت انگیز طور پر طبقاتی شعور کا احساس تھا۔ اس لیے بعض نقاد انہیں پہلا ترقی پسند شاعر کہتے ہیں۔ لیکن نظیر کو اس معنی میں ترقی پسند شاعر نہیں کہا جا سکتا جو آج کل مروج ہے کیونکہ نظیر کے عہد میں اس کا ادراک نہیں تھا۔ انہوں نیز ر، کوڑی، روپیہ، آٹا، دال، روٹی، مفلسی، پیسہ، آدمی نامہ جیسی نظمیں لکھیں۔ ان نظموں نے نظیر کے طبقاتی شعور کو اجاگر کیا۔ ہم سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ خوبصورت دوشیزہ عصمت فروشی کی زندگی گزارنے پر کیوں مجبور ہو جاتی ہے؟ غریب طبقے کے لوگ چوری کی طرف کیوں مائل ہو جاتے ہیں؟ بھیک کیوں مانگی جاتی ہے؟

اس سوال کے جواب کے لیے ماہر نفسیات اور علماءِ دین تجزیہ نفس سے لے کر مذہب اور اقتصادیات تک سوچتے ہیں لیکن نظیر نے اس کا وہی جواب دیا ہے جو آج کی دنیا کے بہترین ماہر نفسیات و معاشیات دے سکتے ہیں۔ یہ چیز ان کے میل جول کو ظاہر کرتی ہے۔ انہوں نے وہی زبان استعمال کی جو عوام کی زبان تھی اور عوام کی زبان نظیر کی زبان تھی۔

زبان کی مہارت اور مطالعہ و مشاہدہ کے لحاظ سے انشاء کے علاوہ کوئی شاعر نظیر کے مدمقابل

نہیں ٹھہرتا۔ناقدین ادب کی رائے ہے کہ اس ذخیرہ الفاظ کے اعتبار سے کوئی ان کا ثانی نہیں وہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر بلا جھجک پردہ اٹھا دیتے ہیں۔ان کی قادر کلامی کا یہ حال ہے کہ اردو، فارسی، عربی، پنجابی اور ہندی الفاظ کو بخوبی استعمال میں لاتے ہیں۔

معاشرے کی بدحالی اور سماجی مسائل کو اپنی شاعری کی شکل میں ان تمام خرابیوں اور برائیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کا حل بھی تجویز کرتے ہیں کہ جب کوئی دوسری طاقت آپ پر غالب ہوتی ہے تو طنز و مزاح ہی واحد ذریعہ ہوتا ہے کہ عوام کو بتا بھی دیا جائے اور برا بھی نہ لگے۔کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:

آٹے کے واسطے ہے ہوس ملک و مال کی
آٹا جو پالکی ہے تو ہے دال نالکی

آٹے ہی دال سے ہے دوستی یہ حال کی
اس سے ملی ہے خوبی جو ہے حال تال کی

(3)

دال آٹا کی فلاسفی کے بعد روٹی کا مطالعہ کیا جاتا ہے یعنی جسم ہے تو روح ہے۔جب جسم کو تسکین ملے گی وہی رحمتوں کی ایک شکل ہے اور چولہے کے نیچے جلتی آگ سب سے خاص نور ہے۔ انداز سخن ملاحظہ ہوں:

کپڑے کسی کے لال ہیں روٹی کے واسطے
لمبے کسی کے بال ہیں روٹی کے واسطے
باندھے کوئی رومال ہیں روٹی کے واسطے
سب کشف اور کمال ہیں روٹی کے واسطے

(4)

نظیر نے عوام کی عکاسی کی اس لیے وہ عوامی شاعر مانے جاتے ہیں۔انہوں نے عوام کے ہر

رنگ اور پہلو کو دیکھا اور آواز بلند کی اور بہت ہی اچھے طریقے سے عوام کے مسائل کی ترجمانی کی ہے۔ اس لیے نظیر اکبر آبادی کے لیے ''عوامی شاعر'' کا لقب موزوں ہے۔ کیونکہ وہ لب و رخسار کی شاعری میں نہیں پڑا بلکہ عوامی مسائل کی ترجمانی کر کے حقیقت کو پیش کیا ہے۔ حضرت علیؑ کا قول ہے۔ ''جب روٹی انسان کی مزدوری سے مہنگی ہو جائے تو تین چیزیں سستی ہو جاتی ہیں، عورت کی عزت، مرد کی غیرت اور انسان کا خون''۔

نظیر کے کلام کو سراہنے والا ایک انگریز ڈاکٹر فیلن تھا۔ انہوں نے اپنی مشہور کتاب ''ہندوستانی انگلش ڈکشنری'' میں نظیر کے فن پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "صرف یہ ایک شاعر ہے جس کی شاعری اہل فرنگ کے نصاب کے مطابق سچی ہے۔" لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اس کے اہل وطن اسے شاعر ماننے کو تیار نہیں۔ کیونکہ شاعری ان کے نزدیک محض گل و بلبل، عشق و عاشقی، فلسفہ و تصوف کا نام ہے۔ جب کہ نظیر نے شاعری کا موضوع عوامی چیزوں کو بنایا۔ انہوں نے ایسے موضوعات پر شاعری کی جس پر اہل ذوق ناک و بھوں چڑھاتے ہیں۔ یعنی آٹا، دال مکھی، مچھر، میلے ٹھیلے، برسات کی بہاریں، ہولی، دیوالی، بیساکھی بسنت وغیرہ وغیرہ۔ یہ حقیقت ہے کہ نظیر اکبر آبادی نے اپنے زمانے کی عوامی تصویروں کو اپنے کلام میں محفوظ کر دیا۔

الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد وغیرہ سبھی کے مزاج میں انفرادیت تھی۔ نئی فکر و روشن ذہنوں کے ساتھ ادب میں داخل ہوئی تو اردو ادب نئی سوچ، نئے فکر و فن، نئے متنوع موضوعات اور نئے اسلوب سے باقاعدہ متعارف ہوا۔ ادیبوں اور شاعروں نے مغرب سے آئی ہوئی نئی تہذیب اور ادب سے استفادہ کیا اور سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کو بھی سامنے رکھ کر ادب تخلیق ہوا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے احساس کی دولت دے کر انسان کو اشرف المخلوقات بنایا۔ جس کے پاس یہ سرمایہ ہوتا ہے اسے دوسروں کا دکھ درد بھی اپنا لگتا ہے۔ اللہ پاک کو وہی بندا محبوب ہے۔ جو اپنے سوا کسی اور کا درد بھی محسوس کرے اور ممکن حد تک اسے دور کرنے کی بھی کوشش کرے۔ یہ دکھ درد و الم کا احساس کرنے والے شاعر حضرات جو اپنی حساس طبیعت کی بنا پر اپنی شاعری کے ذریعے

معاشرتی مسائل ومصائب کو اپنے کلام کے ذریعے پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ ان کی تکلیفوں اور مسائل کو تو عملی طور پر ختم کرنے سے قاصر ہیں مگر اپنی شاعری کے پر اثر الفاظ سے ان کے درد کو کم کرنے اور حوصلہ اور آس وامید کے چراغ روشن کر کے ان میں جینے کی تمنا اور زندگی کے مسائل سے نپٹنے کا سلیقہ ضرور سیکھ لیتے ہیں۔

فرخندہ رضوی کی شاعری میں زندگی مختلف صورتوں میں جھلک دکھاتی ہے۔ اس میں ان کے میٹھے اور کڑوے دونوں طرح کے تجربات اور مشاہدات کا عکس نظر آتا ہے۔ وہ پاکستان سے دور برطانیہ کے شہر ریڈنگ میں اگرچہ آرام دہ زندگی کی برکات سمیٹ رہی ہیں۔ انہیں ان مشکلات کا سامنا نہیں جو پاکستان کے عوام کا مقدر ہیں۔ لیکن وہ محبّ وطن ہونے کی بدولت ان کی پریشانیوں سے آگاہ بھی ہیں اور یہ آگہی وشعور انہیں دکھی بھی کرتا ہے۔ وہ اپنے ملک کے باسیوں کے دکھ درد کو محسوس کر کے کڑھتی بھی ہیں اور بے چینی واضطراب کی کیفیت میں ان کے لیے دعا گو بھی ہوتی ہیں۔

سیالکوٹ کی مٹی سے جنم لینے والی فرخندہ رضوی کا دامن درد کی دولت سے مالا مال ہے۔ حزن والم کی ہمراہی میں وہ کٹھن راستوں پر بہت دیر تک ننگے پاؤں تک چلی ہیں۔ اسی آبلہ پائی نے انہیں درد سے مانوس وآشنا کیا ہے۔ بقول محمد اشفاق ایاز:

> "فرخندہ رضوی نے رشتوں کے جذبات، پردیس کی تنہائی، وطن سے دوری کا کرب، اپنائیت وغیریت، دوستی، جدائی، وفا بے وفائی، آنسو، بے قراری، سالگرہ، بہار، خزاں، تمنا، بے حسی، ویرانی، زخم، تصویر، دعا، غرضیکہ ہر موضوعات پر لکھا ہے۔ جو ہر جیتے جاگتے انسان کی زندگی کا اہم ترین حصہ ہیں جن کے بغیر زندگی ادھوری ہی نہیں نامکمل ہے۔"(5)

فرخندہ رضوی زوال پذیر معاشرے اور زندگی کے مسائل ومصائب سے آگہی کا ثبوت اپنی شاعری میں دیتی نظر آتی ہیں۔ زندگی کے اتار چڑھاؤ کی کشمکش کو یوں بیان کرتی ہیں:

اس شہر کی بلند عمارت کے قرین
ہر جھونپڑی میں درد کی ماری ہے زندگی

(6)

شعر کی تاثیر شاعر کے کلام کے معیاری ہونے کا ثبوت ہوتا ہے۔اس لیے شعر کی تاثیر سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔سامعین کو اکثر اس سے حزن یا نشاط، جوش یا افسردگی کم یا زیادہ ضرور پیدا ہوتی ہے اور اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اگر اس سے کچھ کام لیا جائے تو وہ کہاں تک فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ بھاپ سے جو حیرت انگیز کرشمے اب ظاہر ہوئے ہیں ان کا سراغ اول اس خفیف حرکت میں لگا تھا جو اکثر پکتی ہانڈی پر چینی کو بھاپ کے زور پر ہوا کرتی ہے۔اس وقت کون جانتا تھا کہ اس ناچیز گیس میں جرار لشکروں اور ذخار دریاؤں کی طاقت چھپی ہوئی ہے۔ بقول الطاف حسین حالی:

"دنیا میں ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمی ایسے پیدا ہوئے ہیں۔جن کو قدرت نے اسی کام کے لیے بنایا تھا اور یہ ملکہ ان کی طبیعت میں ودیعت کیا تھا بس ایک عطیہ کو جسے قدرت نے عنایت کیا ہو۔۔۔عبث اور بیکار نہیں کہا جاسکتا۔عقل خدا کی نعمت ہے مگر بہت لوگ۔۔۔مکر و فریب، شر و فساد میں استعمال کرتے ہیں۔ شجاعت ایک عطیہ الہیٰ ہے۔۔۔مگر قتل و غارت و رہزنی میں صرف کی جاتی ہے۔کیا اس سے عقل کی شرافت اور اس شجاعت کی فضیلت میں کچھ فرق آسکتا ہے؟ ہرگز نہیں اسی طرح ملکہ شعر کسی برے استعمال سے برا نہیں ٹھہر سکتا۔"(7)

تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ شعراء نے اپنی جادو بیانی سے لوگوں کے دلوں پر نمایاں فتح حاصل کی ہے۔بعض اوقات شاعر کا کلام جمہور کے دل پر ایسا تسلط کرتا ہے کہ شاعر کی ہر اک چیز یہاں تک کہ اس کے عیب بھی خلقت کی نظر میں مستحسن معلوم ہونے لگتے ہیں۔

ایسا کمال صرف ایک شاعر ہی کرسکتا ہے۔تاریخ شاہد رہی ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے

مسلمانوں کی دگرگوں حالت اور خواب غفلت سے بیدار کرنے کا سہرا اقبال جیسے مرد مومن کے حصے میں آیا اور واقعی ان کی شاعری نے سوئی قوم کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور بعد میں اسی روایت کو فیض احمد فیضؔ، منیرؔ نیازی، مجید امجدؔ، ناصرؔ کاظمی اور ایسے کئی شعراء نے آگے بڑھایا اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا ہے اور جب تک دنیا ہے اور اردو ادب کا وجود ہے شاعر حضرات اپنے کلام سخن کے ذریعے اپنے عہد کی عکاسی کرتے رہیں گے۔ان کی شاعری اور شعر کا یہ سلسلہ یونہی رواں دواں رہے گا۔فرخندہ رضوی نے بھی قلبی واردات، جذبات و احساسات اور مشاہدات و تجربات نچوڑ نچوڑ کر شعر کہے ہیں جو اپنی سحر انگیزی کے سبب نوک زبان پر آتے ہیں اور دلوں میں خیمہ زن ہو جاتے ہیں۔بقول ڈاکٹر تسلیم الٰہی زلفی:

> "فرخندہ رضوی کی شاعری، کالموں اور فکاہیوں میں معاشرتی محرومیوں، خواہشوں کی شکست و فتح وقت کی جبریت اور ابدیت اقتصادی اور احتجاجی صعوبتوں کے مراحل انصاف اور محنت کی اقدار کی پامالی جیسے موضوعات موجود ہیں جو تکنیکی اعتبار سے جدت اور تناؤ کے عناصر اور حقیقت کے توازن۔۔۔۔ ملتے ہیں۔بحیثیت آمد پرستی۔۔۔۔شعور و ادراک کا غلبہ اور انصاف و آگہی کا رویہ اپنا اعتبار قائم کرتا دکھائی دیتا ہے۔"(8)

جس طرح انسانی معاشرہ تبدیل ہوتا ہے۔اسی طرح شعری فکر بھی بدلتی رہتی ہے۔جو شاعر وقت کے ساتھ نہیں چلتا وہ پیچھے رہ جاتا ہے۔شاعر کی جڑیں دراصل اپنے سماج میں پیوست ہوتی ہیں۔شاعر انہیں کا عکاس ہوتا ہے۔شاعری دراصل ذات کا اظہار اور اردگرد پھیلی زندگی کا عکس ہوتا ہے۔ہر دو صورتوں میں سچ شاعری کو معتبر بناتا ہے۔فرضی خیالات جذبات سے عاری ہوتے ہیں۔تاثیر سے بیگانہ ایسی شاعری جو دلوں پر اثر نہ کرے وہ بیکار ہے۔

فرخندہ رضوی کی شاعری سچی اور کھری شاعری ہے۔انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو اپنے احساسات اور جذبات کے ذریعے اظہار کر کے اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔سماج فہمی کا شعور

ان کی اس غزل میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ خوبصورت انداز ملاحظہ ہو:

اہل زر سے بھی رابطہ رکھنا
درمیاں میں مگر انا رکھنا
راہ میں مشکلیں بھی آئیں گی
تم مگر عزم و حوصلہ رکھنا
دوست ہو کوئی یا کہ ہو دشمن
فیصلہ دل سے جڑا رکھنا
وقت کیسا بھی آ پڑے تم پر
زندگی سے نہ تم گلہ رکھنا

(9)

فرخندہ رضوی ایسی تخلیق کار ہیں جنہوں نے اردو ادب کی کئی اصناف سخن پر طبع آزمائی کی اور ہر صنف کو بڑی خوش اسلوبی کیساتھ پیش کیا۔

فرخندہ رضوی ہر صنف میں ماہر دکھائی دیتی ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ محنت کا دامن پکڑا اور اپنے احساسات و جذبات کو الفاظ میں ڈھال کر پیش کیا ان کے کلام میں سادگی اور سچائی نے جو تاثیر پیدا کی وہ بہت کم شاعروں میں نظر آتی ہے اور یہ فرخندہ رضوی کے کلام کا منہ بولتا ثبوت کی دلیل ہے۔ بقول الطاف حسین حالی:

"تعریف اگر سچی ہو اور عشق اصلی تو شاعر کے لیے مٹیریل کی کوئی کمی نہیں جس طرح کائنات میں دو چیزیں یکساں نہیں پائی جاتیں۔ اسی طرح ایک انسان کے محاسن دوسرے کے محاسن اور ایک انسان کی صفات دوسرے کی صفات سے نہیں ملتی۔ لیکن جب تعریف سراسر جھوٹی اور عشق محض تقلیدی ہو تو شعرا کو ہمیشہ وہ باتیں جو اگلے لکھ گئے ہیں دہرانی پڑتی ہیں"(10)

اگر چہ شاعر کو ابتداً سوسائٹی کا مذاق اور فاسد بگاڑتا ہے مگر شاعری جب بگڑ جاتی ہے تو اس کی زہریلی ہوا سوسائٹی کو بھی نہایت سخت نقصان پہنچاتی ہے۔ جب جھوٹی شاعری کا رواج پوری قوم میں ہو جاتا ہے تو جھوٹ اور مبالغہ سے سب کے کام مانوس ہو جاتے ہیں جس شاعر کے شعروں میں زیادہ جھوٹ یا زیادہ مبالغہ ہوتا ہے۔ اس کو زیادہ داد ملتی ہے وہ مبالغہ میں زیادہ غلو کرتا ہے تا کہ اور زیادہ داد ملے۔

ادھر اس کی طبیعت راستی سے دور ہو جاتی ہے اور ادھر جھوٹی اور بے سر و پا باتیں وزن اور قافیہ کے دلکش پیرایہ میں سنتے سنتے سوسائٹی کے مذاق میں زہر گھلتا جاتا ہے۔ حقائق و واقعات سے روز بروز مناسبت کم ہوتی جاتی ہے۔ عجیب و غریب باتوں، سوپر نیچرل کہانیوں اور محال خیالات سے دلوں کو انشراح ہونے لگتا ہے۔ تاریخ کے سیدھے سادھے وقائع سننے سے جی گھبرانے لگتا ہے۔ جھوٹے قصے اور افسانے حقائق و واقعہ سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتے ہیں تاریخ، جغرافیہ، ریاضی اور سائنس سے طبیعتیں بیگانہ ہو جاتی ہیں اور چپکے ہی چپکے مگر نہایت استحکام کے ساتھ اخلاق زمیمہ سوسائٹی میں جڑ پکڑتے جاتے ہیں اور جب جھوٹ کے ساتھ ہزل و مخریت بھی شاعری کے قوام میں داخل ہو جاتی ہے۔ تو قومی اخلاق کو بالکل گھن لگ جاتا ہے۔

سب سے بڑا نقصان جو شاعری کے بگڑ جانے یا اس کے محدود ہو جانے سے ملک کو پہنچتا ہے وہ اس کے لٹریچر اور زبان کی تباہی و بربادی ہے۔ جب جھوٹ اور مبالغہ عام شعراء کا شعار بن جاتا ہے تو اس کا اثر مصنفوں کی تحریر، فصحاء کی تقریر اور حواص اہل ملک کے روزمرہ اور بول چال تک پہنچتا ہے کیونکہ ہر زبان کا نمایاں اور برگزیدہ حصہ وہی الفاظ و محاورات اور ترکیبیں سمجھی جاتی ہیں۔ جو شعراء کے استعمال میں آجاتے ہیں پس جو شخص ملکی زبان کی تحریر یا تقریر یا روزمرہ میں امتیاز حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو بالضرور شعراء کی زبان کا اتباع کرنا پڑتا ہے اور اس طرح مبالغہ لٹریچر اور زبان کی رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ شعراء کی ہزل گوئی سے زبان میں کثرت سے نامہذب اور فحش الفاظ داخل ہو جاتے ہیں کیونکہ لغات میں وہی الفاظ مستند اور ٹکسالی سمجھے جاتے ہیں جن کی توثیق و تصدیق شعراء کے کلام سے کی گئی ہو پس جو شخص ملکی زبان کی ڈکشنری لکھنے بیٹھا ہے۔ اس کو

سب سے پہلے شعراء کے دیوان ٹٹولنے پڑتے ہیں پھر جب شاعری چند مضامین میں محدود ہو جاتی ہے اور اس کا مدار محض قوم کی تقلید پر آ رہتا ہے تو زبان بجائے اس کے کہ اس کا دائرہ زیادہ وسیع ہو اپنی قدیم وسعت بھی کھو بیٹھتی ہے۔ زبان کا وہ عقل قلیل حصہ جس کے ذریعے سے شاعر اپنے چند معمولی مضامین ادا کرتا ہے۔ زیادہ تر وہی مانوس اور فصیح گنا جاتا ہے اور باقی الفاظ و محاورات غریب اور وحشی خیال کیے جاتے ہیں پس سوا اس کے کہ کچھ ان میں سے اہل زبان کی بول چال میں کام آئیں یا لغت کی کتابوں میں بند پڑے رہیں اور کچھ ایک مدت کے بعد متروک الاستعمال ہو جائیں اور کسی مصرف میں نہیں آتے ۔ مصنفوں کو تحریر میں اور نہ فصحا کو تقریر میں ان سے کچھ مدد پہنچتی ہے۔ قدما کی تقلید کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جن لفظوں میں بضرورت شعرا نہوں نے تعریف کیا ہے ان کے سوا کسی لفظ میں کوئی تعریف نہیں کر سکتا جو محاورے جس پہلو پر وہ برت گئے ہیں وہ دوسرے پہلو پر ہرگز نہیں برتے جا سکتے ۔ جو تشبیہیں ان کے کلام میں پائی گئی ہیں ان سے سر مو تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔ الغرض کسی زبان کی شاعری کو اس کی زبان سے وہی نسبت ہے جو قلب کو جسد کے ساتھ۔

فرخندہ رضوی ایک اعلیٰ پایہ کی شاعرہ ہیں ان کی شاعری محض الفاظ کا تانا بانا نہیں اور نہ ہی انہوں نے جھوٹی شہرت کے لیے شاعری کو اپنایا ہے بلکہ وہ سماج کی سچی عکاس کے طور پر جلوہ گر ہوئی ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے معاشرتی مسائل، دکھ درد، اور غم والم بانٹنے اور انہیں اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ وہ سماج کے مسائل کا فہم و ادراک اور شعور رکھنے والی حساس دل کی مالک شخصیت ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1. حقی، شان الحق، فرہنگ تلفظ (طبع چہارم)، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد۔2002ء ص:636
2. سید احتشام حسین، تنقیدی جائزے، (طبع سوم)، احباب پبلیشرز لکھنو، دہلی، 1954ء، ص:168
3. نظیر اکبر آبادی، جواہر کلیات نظیر، حصہ اول، مکتبہ ابراہیمیہ اورادباہمی اسٹیشن روڈ حیدر آباد 102 دکن، ص:106
4. نظیر اکبر آبادی، جواہر کلیات نظیر، حصہ اول، ریختہ، ص:106
5. محمد اشفاق ایاز، قلم خندہ، ورلڈ پنجابی فورم، پاکستان، روزن ادبی فورم گجرات، 2015ء، ص:14
6. فرخندہ رضوی، زیر لب خندہ، بزم تخلیق ادب پاکستان، کراچی، 2012ء، ص:200
7. مولانا الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری سیونتھ سکائی پبلی کیشنز، غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40، اردو بازار لاہور، اکتوبر 2015ء ص:4
8. ڈاکٹر تسلیم الٰہی زلفی، تخلیق خندہ، اردو سخن، آرٹ لینڈ، گرلز کالج روڈ، لاہور، چوک اعظم (لیہ) ڈیوس روڈ لاہور، نمود اول، 2021ء، ص:21
9. فرخندہ رضوی، خوشبوئے خندہ، بزم تخلیق ادب پاکستان، کراچی 2018ء ص:51
10. مولانا الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری سیونتھ سکائی پبلیکیشنز، لاہور، اکتوبر 2015ء، ص:22

☆☆☆☆☆☆☆

فرخندہ رضوی کی شاعری میں سماجی پہلو

فکر اور تخیل تخلیق کی بنیاد مانے جاتے ہیں۔ درحقیقت تخلیق کی عمارت جس بنیاد پر تعمیر کی جاتی ہے۔ اسے فکر اور سوچ کا نام دیا جاتا ہے۔ عمارت کی بنیاد جس قدر مضبوط اور پختہ ہوگی، یقیناً عمارت بھی اتنی ہی مضبوط ہوگی اور دیرپا قائم رہے گی۔ یہی حیثیت کسی بھی فن پارے میں فکر کو حاصل ہے۔ معیاری سوچ کی گہرائی اور وسعت دونوں مل کر ہی فن پارے کو شاہکار بناتے ہیں۔ تخلیقی عمل تو بہت بعد میں آتا ہے۔ پہلے ایک فکری سوچ انسانی دماغ میں پیدا ہوتی ہے اور ہر تخلیق کار اپنے الفاظ کے ذخیرہ کو بروئے کار لاتے ہوئے اظہار کے پیرائے میں سجاتا ہے۔ چنانچہ یہ بات روز اول کی طرح روشن ہے کہ کسی بھی فن پارے کا آغاز فکر، سوچ اور خیال سے ہوتا ہے۔

شاعری انسانی جذبات و احساسات اور تصورات کون سی شکل دینے کا نام ہے۔ یہ ایک ایسی ساحرہ ہے جو ماضی، حال اور مستقبل کو بھی ایک جگہ یکجا کر سکتی ہے۔ شاعری کی کئی صورتیں ہیں کبھی یہ خودسپردگی کا جذبہ ہے تو کبھی یہ باغیانہ رویہ ہے۔ کبھی یہ گھٹی ہوئی چیخ ہے تو کبھی انا الحق کا نعرہ ہے۔ کبھی یہ عشق و محبت کا پرچار ہے تو کبھی مقصد زندگی کا اظہار ہے۔ کسی بھی شاعر کی زندگی اس کی شاعری پر کسی نہ کسی حوالے سے اثرات ضرور مرتب کرتی ہے۔ شاعر اردگرد کے ماحول سے جو کچھ حاصل کرتا ہے یا اردگرد کا ماحول اسے جن سوچوں سے نوازتا ہے۔ وہی سوچیں شاعری کی بنیاد بنتی ہیں۔ شاعر کے خیال اور اس کی سوچ پر معاشرہ، رہن سہن، گریلو حالات اور کسی بھی طرح کے محرومی اثرات ضرور مرتب کرتی ہے۔ محقق شاعر کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اس طرح اجاگر کرتا ہے کہ شاعر کی شاعری اور زندگی کا آپسی تعلق پوری طرح واضح ہو جاتا ہے اس لئے شاعر سے وابستہ لوگوں سے معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔ جہاں تک غزل کے معیار کی بات ہے تو اسلوب اور تخیل یکساں اہمیت کے حامل ہیں۔ کوئی بھی شاعر اپنے ہم عصروں سے الگ اور منفرد مقام رکھتا ہے تو اس میں جتنا شاعرانہ اسلوب کا ہاتھ ہوتا ہے اس اسی قدر اس کی سوچ اور خیال کا بھی حصہ ہوتا ہے

اردو ادب کی دو اصناف ہیں۔ نثر اور نظم، اصناف نظم میں غزل کو خاص اہمیت حاصل

ہے۔عموماً غزل کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ "عورتوں سے اور عورتوں کے متعلق باتیں کرنا" لیکن یہ اس کی جامع تعریف نہیں ہے۔غزل تو ہر موضوع کو اپنے اندر سمو لیتی ہے۔اس لیے کسی خاص موضوع کے ساتھ اسے مخصوص کرنا بے جا ہوگا۔ بقول مولانا الطاف حسین حالی:

"غزل کی اصلاح تمام اصنافِ سخن میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔قوم کے لکھے، پڑھے اور ان پڑھ سب غزل سے مانوس ہیں۔ بچے، جوان اور بوڑھے سب تھوڑا بہت اس کا چٹخارا رکھتے ہیں۔وہ بیاہ شادی کی محفلوں میں، وجد وسماع کی مجلسوں میں، لہو ولب کی محبتوں میں تکیوں میں اور رمنوں میں برابر گائی جاتی ہے"(1)

تمام اصناف سخن میں غزل قدیم ترین صنف ہے مگر اس کی تروتازگی ہمیشہ سے قائم ہے اور رہے گی۔آج کی غزل میں موضوعات بہت زیادہ ہیں۔کیونکہ نئے نئے اور اچھوتے موضوعات کو غزل یا نظم میں سمونا ہی شاعر کو دوسرے شعرا سے منفرد بناتا ہے۔فکر اور تخیل کا ندرت پن ہی شاعری کو وسعت اور جلا بخشتا ہے۔غزل کے اندر نئے نئے موضوعات نے اپنی جگہ بنالی ہے اور بناتے ہی جارہے ہیں جو کبھی فقط نظم کا خاصہ تھے مگر گزرتے وقت نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ شائد ہی کوئی موضوع ہے جس پر غزل نے بات نہ کی ہو۔اگر کسی شاعر کے کلام میں بے ساختگی، رنگارنگی اور تنوع مضامین موجود ہوں تو ایسا شاعر بجا طور پر دادِ تحسین کا مستحق ہوتا ہے۔بقول ڈاکٹر ممتاز الحق

"غزل کے نظریات کے سلسلے میں ہمیں تین نظریات ملتے ہیں۔ ایک نظریہ ہے کہ غزل کا کوئی موضوع نہیں ہوتا۔دوسرے وہ لوگ ہیں جو غزل کا موضوع صرف عشق ومحبت کو مانتے ہیں۔ اس میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ایک محض جنسی محبت کو محبت مانتے ہیں دوسرے لوگوں کے لیے اس کا دائرہ کافی وسیع ہے اور وہ لوگ عشق حقیقی کو بھی اس میں شامل کرتے ہیں۔تیسرا نظریہ یہ ہے کہ غزل کو کچھ خاص موضوعات کے حصار میں محدود

نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس میں ہر طرح کے مضامین شامل کیے جا سکتے ہیں"(2)

ادب میں ان گنت نگینوں کی نشاندہی ملتی ہے۔ جن کو منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے۔ میرے مقالے کا موضوع بھی اس سلسلے کی کڑی ہے اور میں جس نگینے کو منظر عام پر لانے اور اردو ادب میں ان کے مقام و مرتبے کے تعین کے لیے کوشاں ہوں وہ خوبصورت شخصیت "فرخندہ رضوی" ہیں۔ جو اردو شاعری میں منفرد، ممتاز اور جدید لہجے کی شاعرات کی صف میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ فرخندہ رضوی کی صورت میں جو ستارہ اردو ادب کے افق پر روشن ہوا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ وہ تا قیامت ایسے ہی روشن اور جگمگا تا رہے۔ آمین۔

سنو خموشی کی داستان

فرخندہ رضوی جو آج کے دور کی شاعرہ ہیں۔ ان کے شعری مجموعے "سنو خموشی کی داستان" اور "فاصلے ستا رہے ہیں" آزاد شاعری اور پیرایۂ غزل میں ایک نیا منفرد کلام ہے۔ جو پر تاثیر ہونے کی وجہ سے اردو شاعری میں قیمتی اضافہ کی سی حیثیت سے متعارف ہوا ہے۔ بنیادی طور پر وہ آزاد نظموں کی شاعرہ ہیں۔ ان کی شاعری اسلوب بیان کی تازگی اور سادگی و سلاست کا مرقع ہے۔ بقول سلیم احمد:

> "آزاد غزل کی خوش آئند بات یہ ہے کہ اس نے روایتی غزل کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ روایتی غزل کی طرح ہر آزاد غزل اپنی اپنی وجہ بحر میں لکھی گئی ہے۔۔۔ ہر شعر میں علیحدہ علیحدہ قافیہ و ردیف ہے۔ کہیں کہیں مطلع اور مقطع بھی نظر آ جاتے ہیں۔۔۔ تبدیلی صرف اتنی کی ہے کہ۔۔۔ دونوں آمروں (قافیہ، ردیف) سے ان کی وہ کرسیاں چھین لی گئی ہیں۔ جن پر بیٹھ کر وہ شاعری کے۔۔۔ باغ کے پکے ہوئے پھلوں کو بے جا کاٹنا اپنا حق سمجھتے تھے"(3)

اپنے احساسات و جذبات کو یوں بیان کرنا کہ وہ گزرے ہوئے لمحوں کی ترجمانی کرنے

لگیں انتہائی خوشیوں اور غموں کو اس طرح سے بیان کرنا کہ وہ دل کو چھو جائے بہت کم شعرا میں یک جا ملتے ہیں مگر فرخندہ رضوی کی شاعری میں یہ سب کچھ اکٹھا ملتا ہے۔ اس "خموشی کی داستاں" میں کبھی تو انہوں نے لہروں سے شکایت کی اور کبھی سمندر کی ہلچل کو شدت سے محسوس کیا۔ بہت سی تحریریں صاف گوئی سے آسمان پر ستاروں کی مانند بکھرائی گئی ہیں اور کچھ کو ہونٹوں سے سانسوں تک چھوتے ہوئے محسوس کیا ہے۔ جنہیں لفظوں میں سمیٹنا ناممکن ہے۔

اس کتاب کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعرہ فرخندہ رضوی نے بنی نوع انسان کے احساسات، جذبات، خواہشات کو قلم کے ذریعے دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ یہ فطری بات ہے کہ معاشرے میں رہتے ہوئے ہم سب ان عام باتوں کو محسوس تو کرتے ہیں مگر بیان کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں مگر اس کام کو فرخندہ رضوی نہایت خوبصورتی سے بیان کرتی ہیں تو یوں لگتا ہے کہ یہ سب ہمارے ہی احساسات و محسوسات ہیں اور ہمارے ساتھ ہی ہو رہا ہے اور یہ ان کی انسانی نفسیات پر عبور حاصل کرنے کی دلیل ہے۔ جس میں وہ پوری طرح جلوہ فرما ہوتی ہیں اور قاری کے دل پر انمٹ نقوش ثبت کرتی جاتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر نائلہ بٹ:

> "اپنے احساسات و جذبات کو یوں بیان کرنا کہ وہ گزرے ہوئے لمحوں کی ترجمانی کرنے لگیں۔ انتہائی خوشیوں اور غموں کو اس طرح بیان کرنا کہ وہ دل کو چھو جائے بہت کم شعرا میں یک جا ملتے ہیں۔ فرخندہ کی تحریروں میں یہ سب کچھ اکٹھا ملا۔ محبت وجنون میں بسی ان خوبصورت تحریروں کا مجھے تو ایک ہی رنگ دکھائی رہتا ہے محبت۔۔۔۔ جس میں محبت کی تلاش میں ہر کوئی سرگرداں رہتا ہے" (4)

اللہ تعالی کے اپنے بندوں کو پیدا کرنے کے بہت سے مقاصد ہیں کیونکہ دنیا میں کوئی بھی ذی روح ایسا نہیں جو فالتو ہو۔ ہر چیز کو پیدا کرنے کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے، جن میں ایک مقصد تو یہ ہے کہ وہ شر کی اس سرزمین پر "خیر" کے دیے جلائیں اور شر کا خاتمہ کر کے شر کے اندھیروں کو دور کر کے خیر کی روشنی پھیلائیں۔

اس دھرتی پر اللہ پاک کے جس بندے نے بھی قلم اٹھایا اور اپنے دکھ سکھ کا اظہار اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں سہی، معاشرے میں بسنے والے لوگوں تک پہنچایا اپنے رب کے گن گائے۔ اسکی نعمتوں کا شکر ادا کیا۔ اپنے گلے شکووں کو اظہار کی زبان دی، سماج کی اچھائیوں برائیوں پر اظہار خیال کیا۔ رشتوں کے تقدس کو پامال کرنے والے لوگوں کو بے نقاب کیا۔ غربت وافلاس، سیاست، اداسی، تنہائی، موسم، عشق ومحبت کے جولانی جذبے اور جدائی اور بیوفائی وغیرہ کا ذکر کیا تو گویا اپنے اس علم کا حق کسی حد تک تو ادا کیا، جو اللہ پاک نے بندے کی توفیق واستطاعت کے مطابق اسے عطا کیا ہے۔

ایسے گنے چنے لوگوں میں فرخندہ رضوی کا بھی نام آتا ہے۔ ان کی نظمیں اور غزلیں داخلی واردات قلبی سے جنم لیتی ہیں جو گردوپیش میں ہونے والے واقعات کی عکاسی بھی کرتے ہیں اور عالمی سطح پر نمودار ہونے والی سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی تبدیلیوں کی آئینہ دار ہیں وہ زندگی کے بدلتے ہوئے رجحانات پر نظر رکھتی ہیں اور عہد حاضر میں ہونے والے واقعات سے بھی باخبر ہیں۔ شہزاد احمد فرخندہ رضوی کے شعری مجموعوں کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "سنو خموشی کی داستان، فرخندہ رضوی کی ابتدائی "آزاد شاعری" کا پہلا ترجمان ہے۔ 190 صفحات کے اس مجموعہ کلام کو بہت قرینے سے شائع کیا گیا ہے۔ دوسرا مجموعہ کلام "فاصلے ستارے ہیں"۔ فرخندہ رضوی کے سفر شاعری کا دوسرا معتبر حوالہ ہے۔ فرخندہ رضوی کی آزاد شاعری ابھی ارتقاء پذیر ہے اس میں تحریک وتفکر دونوں کارفرما ہیں۔ فرخندہ رضوی شعری راہوں پر اپنے پیر جمانے کی کوششوں میں مصروف ہے اس کا کوئی استاد نہیں۔ وقت نے اسے اجازت نہیں دی کہ ہجوم دانشوراں میں کوئی سچا اور کھرا استاد تلاش کر سکے "(5)

جدید اردو نظم گوئی کا وہ پودا جو مولانا آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی نے لگا کر نئی نظم کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس بنیاد کو لے کر اکبر الہ آبادی، اسماعیل میرٹھی، علامہ اقبال جیسے عظیم لوگوں نے مل کر اس

پودے کی آبیاری کی۔اس سفر میں آگے چل میراجی اور ن۔م۔راشد بھی اس قافلے میں شامل ہو گئے یوں اس کارواں نے اس پودے کو تناور مضبوط درخت بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ بعد آنے والے شعرا نے آزاد نظم کو ہی اپنے احساسات وجذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور پابند نظموں کو لکھنے سے گریز کرتے ہوئے اردو شاعری میں وسیع پیمانے پر آزاد نظمیں لکھیں۔ کچھ شعرا نے صرف نظم کے میدان میں قسمت آزمائی کی مگر کچھ ایسے بھی سخن دلنواز تھے جنہوں نے نظم اور غزل دونوں میدانوں کو سر کرنے کی ٹھانی اور اپنے فن کے جوہر دکھائے۔

دور ابتدا میں شاعرات میں سب سے پہلے مہ لقاہ چندہ پہلی شاعرہ کے روپ میں سامنے آتی ہیں۔اس کے بعد بحیثیت شاعرہ زہرہ نگاہ شعروسخن میں اپنی دھاک بٹھانے آئیں۔عصر حاضر میں خواتین فن شعروسخن کی جانب کچھ زیادہ ہی مائل نظر آتی ہیں۔ پاکستان میں پروین شاکر، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، ادا جعفری اور شاہینہ فلک جیسی بلند مرتبہ شاعرات کا بول بالا رہا ہے

فرخندہ رضوی کا شمار بھی ایسی شاعرات میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی شاعری کی ابتدا آزاد نظم سے کی۔زیر نظر کتاب "سنو خموشی کی داستان" ایک آزاد شعری مجموعہ کلام ہے۔جس میں انسان سے متعلقہ موضوعات کو آزاد نظم کے پیرائے میں سجا کر پیش کیا گیا ہے۔

فاصلے ستا رہے ہیں

فرخندہ رضوی کی دوسری کتاب ''فاصلے ستا رہے ہیں، نظموں اور غزلوں پر مشتمل کلام ہے۔ اپنے ان شعری مجموعوں میں انھوں نے اپنے اسلوب، فن اور فکر کی وجہ سے ہم عصروں میں اپنا منفرد مقام بنانے کی بھرپور کاوش کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ شاعری کرنا ایک مشکل فن ہے۔ کیونکہ کسی بھی موضوع کو لے کر اسے شعری صورت میں بیان کرنا کمال فن ہے اور یہ کمال فرخندہ کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے۔

فرخندہ رضوی چونکہ طویل عرصہ سے پردیس میں رہ رہی ہیں اور سماج میں رہتے ہوئے وطن سے دور رہنے والے پردیسیوں کی محسوسات کو سمجھتی ہیں اس لیے پردیس میں رہنے والے لوگوں کی کیفیت کو اپنے شعری مجموعے ''فاصلے ستا رہے ہیں، میں یوں بیان کرتی ہیں:

"تتلیاں اداس اداس

سی پھرتی رہیں
پھول کملائے کملائے سے
ساحل سے سمندر کی لہریں
دور میں کتنی.....
آسمان وزمین سے گلے
ملتا نہ دکھائی دے
چاند کی چاندنی اندھیرے
میں چھپنے لگی ایسے۔۔۔۔
اس وقت کی یہ سب اداسی
ہے شائد؟
آج فاصلے ستا رہے ہیں مجھے "(6)

اس قلم میں شاعر کی فکر اور فن دونوں کا اظہار ہو رہا ہے۔ پردیسیوں کی اپنے پردیس اور اپنے پیاروں کی جدائی کا غم اور سوچ کو ہماری شاعرہ فرخندہ رضوی نے فکر اور فن کے امتزاج کو بڑی خوبصورتی اور ندرت بیان سے پیش کیا ہے۔ معاشرتی مسائل کی عکاسی ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ فرخندہ رضوی بنیادی طور پر نظم گو شاعرہ ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر آزاد نظمیں لکھی ہیں۔ انھوں نے زندگی کے عمومی پہلوؤں کو لے کر ان میں فکر کا رنگ بھر کر ان کو آفاقی کر دیا ہے۔

فرخندہ رضوی کی شاعری میں نئے تشبیہات واستعارات اور علامات کا استعمال ملتا ہے۔ ان کا کام ادب کے قیمتی شہ پاروں میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے زندگی وموت کے درمیان تمام موضوعات کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ ان کے ہاں خلوص اور صداقت کی جھلک نظر آتی ہے جو ان کے سچے شعری اظہار سے ظاہر ہے۔

فرخندہ رضوی نے آزاد نظم اور غزل دونوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے آزاد نظم اور غزل کو ایک نئی سوچ اور نئے لب ولہجے کے پہناوے سے آشنا کیا۔ کائنات کی وسعتوں میں سے موضوعات کو جس جدت سے پیش کیا وہ انہی کا خاصہ ہے۔ ان کی شاعری میں فکر اور جذبے کی گہرائی

نظر آتی ہے۔ان کے خیالات واحساسات میں فکری پہلو ہے۔ان کے تجربات مانگے تانگے کے نہیں ہیں۔ان کے مشاہدات دوسروں کے مرہون منت نہیں،فکر وخیال ادھار لیے ہوئے نہیں۔یہ سب ان کے اپنے جذبہ واحساس کی پیداوار ہیں۔فرخندہ رضوی کے دونوں شعری مجموعوں میں حمد ونعت کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے شہزاد احمد، مدیر "حمد ونعت" کراچی کہتے ہیں:

> "میں نے محترمہ کے دونوں مجموعہ ہائے کلام دیکھے ہیں۔مجھے ذاتی طور پر دونوں میں حمد ونعت کی کمی محسوس ہوئی ہے۔مجھے امید ہے کہ محترمہ فرخندہ رضوی صاحبہ اپنے تیسرے مجموعہ کلام میں اس تشنگی "حمد ونعت" کو دور کریں گی، آپ کے پاس قلم کی طاقت ہے۔سچے جذبات میں بات کہنے کے سے واقف ہیں آپ کی یونہی مشق سخن جاری رہی تو وہ دن دور نہیں کہ آپ کا بھی شمار عصر حاضر کی قابل ذکر اور مستند ومعتبر شاعرات میں ہونے لگے گا"(7)

فرخندہ رضوی چونکہ سماج فہم ہیں اس لیے ان کی شاعری معاشرتی صداقتوں کو سامنے لاتی ہے۔ان کے ہاں تخلیق کا محرک اردگرد کے حالات، رنگ بدلتے مزاج دور کے منافق لوگ، اقتدار کی ہوس زدہ سیاست، سماجی نا انصافی و ناہمواری، غربت وافلاس میں پسے لوگ، مفاد پرستی حاکموں کی ستم ظریفی، عشق ومحبت، وطن دوستی، عظمت انسان، احساس فنا، ظلم وجبر، تنہائی، بے وفائی، اور عہد حاضر کے المیے سمیت تمام موضوعات شامل ہیں۔خصوصا ماں کے حوالے سے فرخندہ بہت حساس ہے اور جابجا اپنی ماں سے محبت اور عقیدت کا اظہار کرتی نظر آتی ہیں۔ان کی آرزو کہیں بلند آہنگ اختیار کرتی ہے تو کہیں رب کریم سے التجا کرتی نظر آتی ہے۔

سماج میں رہتے ہوئے ہر مسلمان کا اللہ سے محبت اور عقیدت کا رشتہ ہوتا ہے اور وہ التجا ودعا کے ذریعے اپنے رب سے رشتہ جوڑتا ہے۔التجا اور دعا درحقیقت عبادت کا مغز ہے۔التجا ودعا کسی بھی عبادت کا ثمر تصور کی جاتی ہے۔خواہشات کے حصول کے لیے التجا ذریعہ بنتی ہے۔انسان التجا کے ذریعے اپنے رب سے مخفی ظاہر خواہشات اور نا آسودہ حسرتوں کا برملہ اظہار کرسکتا ہے۔شاعری

چونکہ نام ہی احساسات و جذبات کا اظہار ہے تو شاعر اپنی شاعری میں التجا و دعا کے ذریعے کبھی معاشرے کی بداعمالیوں کے خاتمے کے لیے اور کہیں اپنی ذات کے ادھورے پن اور خواہشات کی تکمیل کے لیے التجا کرتا ہے۔ دونوں صورتوں میں شاعر مثبت تبدیلی کی خواہش رکھتا ہے۔ وہ حالات کو بہتری کی جانب لے جانے کے لیے التجاؤں میں مصروف رہتا ہے۔ دراصل فن اور فنکار کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔

فنکار کا فن اس کی ذات کی عکاسی کرتا ہے۔ آسودگی کی خواہش مجبور کرتی ہے تو ہاتھ خود بخود اٹھ جاتے ہیں۔ مومن انسان کا اپنے رب پر یقین اسے التجا پر مجبور کرتا ہے۔ کیونکہ فنکار کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ اس کے کام کو، فن کو دائمی زندگی نصیب ہو مگر اس مقصد کے لیے فنکار کو فن کے لیے خون جگر دینا پڑتا ہے۔ سبط حسن اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

> "فنکار کی خوبی تو یہی ہے کہ فنکار کی وابستگی سطح آب پر نہ تیرے، ورنہ آرٹ نہیں بلکہ خالص پروپیگنڈہ بن جائے گا۔ اس کے برعکس فن کا کمال یہ ہے کہ فن کار کی وابستگی کی لہریں تہ آب گہرائیوں میں آہستہ آستہ بہیں"(8)

فرخندہ رضوی اپنے اشعار میں اللہ تعالی کے حضور التجا کے ذریعے خواہشات کی تکمیل کی خواہاں ہیں کہ ہر انسان بالخصوص مومن اپنی حاجات کی تکمیل کے لیے اپنے رب سے التجا اور مناجات کرتا ہے۔ یہ دعا و التجا کا سلسلہ ساری زندگی انسان اور رب کے درمیان جاری و ساری رہتا ہے۔

بلاشبہ دعا بڑی اہمیت کی حامل ہے ایسے بڑے بڑے کام جو پورے ہوتے کسی بھی صورت ممکن نہیں لگ رہے ہوتے، اکثر والدین، بزرگوں، دوستوں اور نیک لوگوں کی دعاؤں کے طفیل ایسے حل ہو جاتے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔ دراصل کوئی بھی کام اللہ کے حکم اور رضا کے بغیر نہیں ہوسکتا تو یہ دعاؤں کا کمال ہی ہوتا ہے کہ اللہ پاک کی ذات کسی کی التجا و دعا کو قبولیت کا شرف بخش کر تمام مسائل کو حل کر دیتی ہے اور انسان کو اپنی منزل مقصود مل جاتی ہے۔ فرخندہ رضوی بھی دعائیہ انداز میں اپنی آسودہ خواہشات کو مکمل کرنے کی دعا و التجا کرتی نظر آتی ہیں۔ اپنے نبی سے عشق کی صورت کو یوں بیان کرتی ہیں:

مدینے کی گلیوں میں حسرت لیے آؤں
بس میرا دامن رحمت سے بھر دے

(9)

بلا شبہ دعا والتجا میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ ذات باری تعالی " کن" کہنے پر آئے تو بڑے بڑے اور ناممکن کام بھی منٹوں میں ممکن ہو جاتے ہیں۔ دراصل کوئی کام اللہ کی رضا کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ لیکن مومن کا پختہ یقین اور ایمان کی فراوانی اور سچے دل کی التجا کو اللہ تبارک وتعالی قبول فرما کر تمام مسائل کو حل کر دیتا ہے۔ فرخندہ رضوی کو یقین ہے کہ وہ اس کی دعاؤں اور التجاؤں کو ضرور سنے گا۔ عقیدت کا انداز ملاحظہ ہو:

چومتی پھروں تیرے ہر در کو
اپنی محبتوں سے میرا دامن بھر دے

(10)

تصوف کو قرآنی اصطلاح میں تزکیہ نفس کہتے ہیں۔ تصوف فقط روحانی، باطنی کیفیات اور روحانی اقدار کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ علمی وفکری، عملی، معاشرتی وتہذیبی اور عمرانی جہتوں میں اخلاق و احسان کا نام ہے۔ جس شخص نے اپنے اخلاق اور معاملات کو مہذب بنایا اور اپنی طبیعت کو بغض و کدورتوں سے پاک کر لیا اور اسلام یعنی اللہ کی سچی عبدیت کا وصف اپنے اندر پیدا کر لیا تو وہ صوفی یا ولی بن جاتا ہے اور اہل تصوف میں شامل ہو جاتا ہے۔

تصوف ایسی بے غرض اور بے لوث دوستی کا نام ہے۔ جو نہ صرف دنیاوی لالچ سے پاک ہو بلکہ اخروی طمع سے بھی پاک وصاف ہو۔ صوفیوں کی تعریف میں کہا جاتا ہے کہ صوفی جمع نہیں کرتا، طمع نہیں کرتا اور ضائع نہیں کرتا۔ صوفی بزرگ بھی مسلمان سماج کا حصہ ہے۔ سماج میں رہ کر جو انسان خود کو تزکیہ نفس جیسی خصوصیات کا حامل بنالیتا ہے۔ تو وہ صوفی یا ولی کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔

فرخندہ رضوی کوئی صوفی ہستی تو نہیں ہیں مگر اللہ کی ذات اقدس پر جان و دل سے توکل رکھنے والی خاتون ہیں۔ برطانیہ میں مکین مگر صوم وصلوۃ کی پابند اور گھریلو ماحول کو بھی دینی روایات سے استوار کیے ہوئے ہیں۔ انداز سخن ملاحظہ ہو:

اے رب میری راہ کو منور کر دے
ہر گھڑی تو اپنا کرم کر دے
سجدے ہو شکرانے کے
ذہن و دل کو روشن کر دے

(11)

محبت لافانی جذبہ ہے۔ دنیا درحقیقت محبت کے جذبے سے ہی قائم ودائم ہے۔ محبت نہ ہوتی تو شائد دنیا کا وجود ہی نہ ہوتا۔ اللہ تبارک وتعالی نے جب اپنے محبوب حضرت محمد ﷺ سے محبت کی اوران کی محبت کے صدقے دنیا تخلیق کی۔ حضرت آدم کو جب دنیا پر اتارا گیا تو ساتھ ہی محبت کا جذبہ بھیجا۔ اگر جذبہ محبت نہ ہوتا تو یقیناً ہر طرف جنگل کا قانون ہوتا۔ دنیا پر ہر طرف ویرانی کا راج ہوتا۔ خودغرضی اور ظلم کا دور دورہ ہوتا۔ رشتوں میں محبت نہ ہوتی ماں باپ اپنے بچوں پر اس جذبہ محبت کی خاطر نہ صرف اپنا سب کچھ قربان کردیتے ہیں بلکہ وقت آنے پر اپنی جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ بھائی بہنوں اور بہنیں اپنے بھائیوں پر صدقے واری نہ ہوتیں۔ اور ماں کی محبت کا تو کوئی نعم البدل ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ کہ کائنات کا نظام جس قوت کے تحت آپس میں مربوط ہے۔ وہ عشق ومحبت کا جذبہ ہے۔ دنیا میں کوئی بھی روایتی داستان محبت وعشق کے ذکر کے بغیر نامکمل اور ادھوری ہے۔ آج کے سائنسی دور اور ٹیکنالوجی کے جدید عصر حاضر میں بھی محبت و عشق کے شواہد جابجا ملتے ہیں۔ محبت بھلے کم ہوجائے مگر ختم نہیں ہوسکتی اور اگر ایسا وقت کبھی آ گیا تو سمجھیے گا کہ دنیا کے ختم ہونے کا وقت آ گیا ہے کیونکہ محبت کے بغیر کائنات کا نظام مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ سماج میں انسانوں کا ایک دوسرے کے ساتھ محبت وتعاون سے اکٹھا رہنا محبت کی راہوں میں سے ایک راہ ہے۔ محبت کے دم سے انسان دوسرے انسان سے کسی باہمی رشتے کے حوالے سے جڑا ہوا ہے۔ محبت کے جذبات نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔

فرخندہ رضوی کی نظموں اور غزلوں میں بھی محبت کے جذبے کے اظہار کی بھرمار ہے۔ ان کی نظم اور غزل میں محبت کا رنگ خوب نکھر کر اپنی جھلک دکھاتا ہے اور اپنے ہونے کا احساس پیدا کرتا ہے۔ یہ محبت کا رنگ بعض جگہوں پر انفرادی طور پر واضح نظر آتا ہے جوان کو اپنی ماں سے خصوصی طور پر

ہے اور کہیں انسانیت سے محبت کا اظہار ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں کہیں تو روایتی محبت کا رنگ نظر آتا ہے۔ اور کہیں عہد جدید کا اندازِ محبت شعروں میں ڈھلتا نظر آتا ہے۔ سماج میں رہتے ہوئے انسانی فطرت میں رقیب پسندیدہ شخصیت نہیں ہوتا۔ کیونکہ محبت میں تقسیم کسی بھی محبوب کو گوارہ نہیں ہوتی۔ عاشق محبوب کو صرف اپنے لئے وقف کرنا چاہتا ہے۔ ایسی عاشقی کو فرخندہ رضوی خوبصورت پیرائے میں یوں بیان کرتی ہیں۔ فرخندہ رضوی کی خوبصورت نظم "برا لگتا ہے" ملاحظہ ہو:

"میری چاہت کا تقاضا ہے میرے ساتھ رہو۔۔۔
کسی اور کو چاہتے ہو تو برا لگتا ہے۔۔
میں ہی تمھارا پیار ہوں وفا کرد مجھ سے
کسی اور کا تھامتے ہو ہاتھ تو برا لگتا ہے۔
مجھ میں خوشبو ہے پیار کی محسوس تو کرو
گلے کسی اور کے لگتے ہو تو برا لگتا ہے" (12)

سچی محبت اور ہوس زدہ محبت میں فرق ہوتا ہے۔ سستی اور ہوس شدہ محبت جس کا مقصد جسموں کے ملاپ کا حصول ہے۔ سچی محبتوں کا راستہ تو صرف دل کی نگری تک جاتا ہے اسے جسم سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ کہ جسم کی بات نہیں مجھے تیرے دل تک جانا ہے۔

فرخندہ کی شاعری سستی اور بازاری نہیں بلکہ پاکیزہ محبت کا پرچار کرتی نظر آتی ہے۔ دراصل محبت ایسا جذبہ ہے جس سے ہو جائے اسے بھلانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا ہے۔ انسان جس سے سچی محبت کرتا ہے۔ اس کی ہر چیز سے لگاؤ ہو جاتا ہے حتی کہ اس کے در و دیوار اور گلی کوچوں سے بھی پیار ہو جاتا ہے۔ محبوب کی ہر ہر ادا سے پیار ہوتا ہے۔ اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے انسان سو سو جتن کرتا ہے۔ فرخندہ رضوی "اک سچ" میں یوں کہتی ہیں:

سمیٹ کر یہ پل کچھ دنوں کے لیے
تمہارے بہت قریب جانا ہے مجھے
(13)

محبت زندگی کا وہ خوبصورت جذبہ ہے۔ جس کے سہارے ساری زندگی گزاری جاسکتی ہے۔

کیونکہ فرخندہ رضوی کے خیال میں محبت کا صرف ایک نام نہیں ہے بلکہ محبت کے بے شمار نام ہے۔کائنات کی ہر چیز محبت کے راگ الاپنے میں مصروف ہے محبت جب اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہیں تو اسے عشق کا نام دے دیا جاتا ہے۔

عشق عربی زبان میں گہری چاہت کو کہتے ہیں۔جب کہ عقل اس جذبے کی توجیہہ پیش کرتی ہے کہ عشق ایسی بے لگام تڑپ کا نام ہے۔جو کسی قاعدے اور قانون کی پابند نہیں ہے۔یہ تمام قید و قیود سے مبرا ہوتی ہے۔یہ عشق کا سفر بقا سے فنا کا سفر ہے۔جس میں محبت درجہ بہ درجہ ترقی کرتے ہوئے عشق اور جنون کی کیفیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔بقول ڈاکٹر یوسف:

> "غزل گو شاعر کے نزدیک پوری زندگی پر حاوی ہے۔جہاں تعلق ہوگا وہاں جذبہ ہوگا۔وہاں کسی پر کسی قسم کا تعلق ضرور ہوگا۔جس طرح فطرت کے مظاہر اور ان کی قوتیں علائق کی زنجیروں میں بندھی ہوتی ہیں۔اسی طرح زندگی بھی تعلقات کی سنہری ڈوریوں سے جکڑی ہوتی ہے۔یہ تعلق فطری بھی ہے اور معاشرتی بھی"(14)

فرخندہ رضوی کی محبت میں ماں کی محبت کی چاشنی خصوصاً دکھائی دیتی ہے۔ویسے تو ہر شخص کو اور خصوصاً بیٹیوں کو ان کی ماؤں سے عقیدت اور عشق کی آخری حدوں تک پیار ہوتا ہے۔لیکن فرخندہ رضوی کی طرح ہر بیٹی اپنی ماں سے محبت کے اظہار کے لیے شاعرہ نہیں بن سکتی۔

فرخندہ رضوی نے اپنی محبت کو اظہار کا پہناوا پہنا کر پیش کیا ہے اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی نظر آتی ہیں۔کیونکہ ان کے اپنی ماں سے محبت کے اظہار سے قاری کو اور خصوصا بیٹیوں کو لگتا ہے کہ وہ فرخندہ کے الفاظ سے اپنی ماں کو خراج تحسین پیش کر رہی ہیں اور یہ دلیل اور ثبوت ہے فرخندہ کی جاندار شاعری کا۔جس سے انکار ممکن نہیں ہے۔ان کی شاعری فکری وفنی لحاظ سے بہترین مانی جاتی ہے۔ماں کا لفظ زبان پر آتے ہی جیسے مٹھاس سی منہ میں بھر جاتی ہے۔ماں جیسی بے غرض ہستی پر عقیدتوں کے خزانے لٹاتے ہوئے کہتی ہیں:

"اک ماں
سمندر سا وسیع سینہ
کہکشاں کے جھرمٹ میں چاند کی طرح
بادلوں کے بعد دھنک رنگ اس میں
شاعر کی غزل.....
وہ مصنف کے تخیل کی طرح
کون ہے وہ جس میں
ساری نعمتیں ملتی ہیں
وہ اک ماں ہے۔۔۔
وہ کہیں بھی ملتی ہے اور
قسمت سے ملتی ہے"(15)

محبت کے رنگ ڈھنگ بڑے نرالے ہیں۔انسان کا مقصد ازل سے ابد تک محبت اور عشق کے دائرے میں ہی گھومتا رہا ہے اور تا حیات گھومتا رہے گا۔

عشق تو بذات خود ایک منزل ہے اس کے آگے کوئی منزل نہیں ہے۔محبت اور چاہتوں کی آخری منزل عشق پر جا کر رکتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک شاعر کو پہلے عشق ہو پھر وہ عشقیہ شاعری کرے اور عشق کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ عشق صرف مرد کو عورت سے ہو اور عورت کو مرد سے ہی ہو۔دنیا میں بڑے پیارے پیارے رشتے ہیں جن سے عشق ہو سکتا ہے۔

عشق غالباً دو قسم کا ہوتا ہے۔عشق مجازی اور عشق حقیقی۔عشق مجازی دراصل ایک انسان کے مکمل وجود یا کسی ایک حصے سے شدت سے پیار اور اپنی طلب کو وجود محبوب کے دائرے تک محدود رکھنا ہے۔دوسرے لفظوں میں کسی ایک فرد کے لیے یا خواہشات کو محبوب کی خواہشات کے تابع کر لینا یا اس کی مرضی کے مطابق خود کو ڈھال لینا، بدل لینا عشق بازی میں آتا ہے۔عشق کی انتہا ملاحظہ ہو بقول انور مسعود:

جیسے تو حکم کرے دل مرا ویسے دھڑکے
یہ گھڑی تیرے اشاروں سے ملا رکھی ہے

(16)

جبکہ عشق حقیقی میں محبوب کے وجود سے ماورا ہو کر اس کی ذات کا طالب بن جانا۔ ایسی صورت میں محبوب کا وجود ہونا لازم نہیں ہے کیونکہ یہاں وجود کی حقیقت ہی باقی نہیں رہتی۔ اللہ تبارک وتعالی درحقیقت وہ ذات جو عشق حقیقی کے مترادف ہے۔ جبکہ عشق مجازی میں کوئی بھی شمار کیا جاسکتا ہے۔ سجدہ انسان کو کروتو وہ عشق کی معراج کہلاتا ہے اور اگر سجدہ رب کے عشق میں ہو تو انسان ولی ہو جاتا ہے۔ عشق حقیقی اور مجازی دونوں صورتوں میں محبوب کو اہم اور بنیادی مقام ومرتبہ حاصل ہے۔ فرخندہ رضوی کی غزل میں عشق حقیقی کا رنگ ملاحظہ ہو:

نا اٹھوں قیامت تک اس در سے
یارب مجھے اپنی رحمتوں کا گداگر کر دے

(17)

عشق مجازی کی صورت یوں واضح ہوتی ہے۔ بقول فاخرہ بتول

" کوئی کتنا جتن کر لے محبت کم نہیں ہوتی
محبت ڈر نہیں سکتی ڈرانے سے
نہیں مٹتی بنانے سے
محبت کی بنتی نہیں زمانے سے
یہ اپنی جان دے کر بھی کبھی بے دم نہیں ہوتی
کبھی یہ ہیر کا جوبن، کبھی رانجھا کی ونجلی ہے
کبھی شیریں کی بے تابی، کبھی فرہاد کا تیشہ
جنون ہے قیس کا، لیلیٰ کی یہ وارفتگی بھی ہے
خودی کا بھید اس میں ہے
محبت بے خودی بھی ہے

محبت ہے خدا جیسی، خدائی اس میں شامل ہے
ستارہ مت کہو، اس کی محبت ماہ کامل ہے
کوئی کتنا جتن کر لے محبت کم نہیں ہوتی"(18)

جہاں محبت ہوتی ہے وہاں ادب اور پاکیزگی بھی ہوتی ہے۔ انسان جب کسی سے عشق کرتا ہے تو اسے دنیا کا خوبصورت ترین انسان سمجھتا ہے۔ وہ جدھر دیکھتا ہے اسے اپنا محبوب نظر آتا ہے یہ عشق کی انتہا ہوتی ہے۔ عاشق اپنے محبوب کے لیے ہر حد سے گزر جاتا ہے درحقیقت عشق اسی کو کہتے ہیں۔ بقول مرزا غالب:

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے
(19)

عشق و محبت کا فلسفہ بڑا عجیب ہے۔ اسے آج تک کوئی سمجھ نہیں پایا ہے۔ عشق نام ہے جدائی کا، عشق کو اگر امر کرنا ہو تو اس شخص سے بچھڑ جاؤ، جس کی عاشقی نے بے حال کیا ہے۔ عشق اگر پانے کا نام ہوتا تو سب سے پہلے لیلی مجنوں کی بنتی، سسی پنوں سے ملتی اور ہیر اپنے رانجھے کے ساتھ زندگی گزارتی مگر عشق قربانی مانگتا ہے عشق جان مانگتا ہے اور سچے دیوانے جان دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ عشق عاشقوں کا امتحان لیتا ہے اور سچے عاشق اس امتحان میں اپنی جان کا نذرانہ دے کر کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔ بقول فرخندہ رضوی:

انا و تکبر تو چور چور کیا
بتا تیری محبت میں کیا اور کروں
سنا تھا نہیں عشق سچا بنا مرے
نہ مروں تو پھر کیا کروں
(20)

سماج افراد کے گروہ کا نام ہے سماج میں خوشی، غم، ملن، تنہائی اور جدائی سب ساتھ ساتھ چلتے ہیں اس کا نام شائد زندگی ہے۔ فرخندہ رضوی کی شاعری میں جابجا تنہائی کا ذکر ملتا ہے۔ ان کی

نظموں اور غزلوں میں تنہائی کے موضوع پر بے شمار اشعار منفرد انداز لیے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تنہائی ایک ایسا المیہ ہے جو یا تو انسان کو نفسیاتی مریض بنا دیتا ہے۔ یا اگر اسے لفظوں کی بنت آتی ہو تو وہ اظہار کے پیرائے میں بیان کر دیتا ہے اور یہ فکر اور فن صرف کسی شاعر کو ہی نصیب ہوتی ہے۔ شاعری چونکہ خدائے بزرگ و برتر کا ودیعت کردہ تحفہ ہے۔ جو مخصوص لوگوں کو عطا ہوتا ہے۔ فرخندہ رضوی کی شاعری اس کی ذات کا حسین مرقع بن گئی ہے جس میں اس نے قلبی واردات کو انتہائی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ ترک رفاقت کے حوالے سے فرخندہ کہتی ہیں:

"میں بکھرا بکھرا تنہا تنہا اداس کتنا رہا
آنکھیں بھیگتی رہیں آنسوؤں کو چھپاتا رہا
کبھی تجھے کبھی خود کو ڈھونڈتا رہا
بھولنے کی لاکھ کوشش میں اک ہی
طرز مخاطب تم کو
ہر تحریر میں چہرہ بن کر دیکھتا رہا" (21)

سماج کا افسوسناک المیہ جو سماج کے ہر دوسرے فرد کی جڑوں میں اس طرح پیوست ہو چکا ہے کہ اس سے جان چھڑانا بہت مشکل ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ شاعری جذبات و احساسات اور داخلی و خارجی کیفیت کے اظہار کا نام ہے۔ ہر شاعر اپنی سوچ اور بساط کے مطابق اپنے اپنے مشاہدات کو شاعری کے پیرائے میں اپنے اپنے انداز سے بیان کرتا ہے۔ فرخندہ رضوی اپنے پیاروں کے ڈنگ سے ڈسی ہوئی ہیں انہوں نے ہر رشتے کو مان دیا۔ ہر رشتے سے پیار کیا ہر رشتے کو نبھانے کے لیے آخری حد تک بھی گئیں مگر انہیں محبتوں کا وہ صلہ نہ ملا جس کی وہ حقدار تھیں۔ فرخندہ رضوی کہتی ہیں:

"میں نے اپنے اردگرد بسنے والے ہر شخص سے محبت کی ہے۔
بے غرض و بے لوث، کبھی کبھی سوچتی ہوں بے غرض کی کی گئی
محبتوں کا انجام کیا ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ
چاہے جانے والوں کے مفادات کا پلڑا اتنا بھاری ہوا کہ ان کی
اڑان پر لگائے اور میرا سفر چیونٹی سا ہو کر رہ گیا۔۔۔ مگر میں نے

ایسے رشتوں سے دھوکا کھایا۔ جنہیں لوگ سوتیلا کہتے ہیں لوگ
کہتے ہیں کہ یہ بے اعتبار رشتے ہوتے ہیں۔ زندگی کے اس تلخ
تجربے نے مجھے بہت کمزور کر دیا"(22)

فرخندہ رضوی کہتی ہیں کہ جن رشتوں کے ساتھ دنوں کی نہیں، مہینوں کی نہیں بلکہ سالوں کی مسافت طے کی ہو وہ اپنا مفاد پورا ہونے کے بعد جب راستہ بدل لیں تو بے لوث محبت کرنے والے کی سوچ چکی میں پستی رہ جاتی ہے۔ پھر وہ سب لمحے کتنے تکلیف دینے لگتے ہیں۔ یہ وہی جانتا ہے۔ وہ مزید کہتی ہیں کہ کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ ایسا کرنے والوں کو کیا ملتا ہے؟ کیا انہیں اس بات کا کبھی ملال ہوتا ہے؟ اور اگر ملال ہو تو اس کا مداوا کیا ہے؟

ایک بات زندگی بھر یاد رہے گی کہ دھوکے میں بڑی جان ہوتی ہے۔ یہ کبھی نہیں مرتا بلکہ گھوم پھر کر واپس ایک دن آپ کے پاس لوٹ کر آتا ہے۔ اسے اپنے ٹھکانے سے بڑی محبت ہوتی ہے۔ میں نے بے غرض ہو کر تقریباً بیس سال اپنوں کے ساتھ مل کر حوصلہ پایا، اس کے بعد مان لینا پڑا کہ لوگ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ بزرگوں کی کئی کہاوتیں جو سنی تھیں وہ سچ ثابت ہوئیں، دل ٹوٹ گیا، مان ٹوٹ گیا، ایک شعر جو خصوصی طور پر اپنے رشتے داروں کے لیے لکھا:

بند آنکھوں میں یہ خواب سجائے تو نہیں تھے
آنسو میری پلکوں میں سمائے تو نہیں تھے
پہلو میں پلتے رہے ڈستے رہے جو
اپنے تھے وہ سب سانپ پرائے تو نہیں تھے
(23)

سیانے کہتے ہیں کہ کبھی وقت اور موقع آئے تو اپنے خونی رشتے پھینکتے ہیں تو چھاؤں میں پھینکتے ہیں تاکہ اذیت زیادہ نہ ہو اس کے برعکس غیر جب دھتکارتے ہیں لا دھوپ میں پھینکتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ تکلیف ہو۔ اگر ایسی بات ہے تو اب اپنوں کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا وقت بدل گیا ہے؟ کیا اب وقت نے بے حسی اوڑھ لی ہے؟ اور یہ بے حسی اور بے رحمی کا سایہ بدقسمتی سے اپنے سگے خونی رشتوں پر آ گیا ہے۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہے۔ حسد کی آگ ہر انسان کو اپنی لپیٹ

میں لے رہی ہے اور یہ ہمارے اپنے سماج میں ہونے والی روداد ہے۔ کہاوت ہے کہ کھاتے پیتے کو کوئی دیکھ نہیں سکتا اور بھوکے کو کوئی دیتا نہیں۔

یہ کیسا وقت اور کیسا دور آ گیا ہے۔ فرخندہ رضوی حساس دل کی مالک ہونے کی وجہ سے معاشرے کی ان برائیوں کو دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ شدت سے محسوس کرتی ہیں اور کچھ اپنے رشتے داروں کے ناروا سلوک سے دل برداشتہ ہو کر اپنے دکھ کو اپنے شعروں میں ڈھال کر اپنے دکھوں کا مداوا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اظہار غم کا خوبصورت انداز سخن ملاحظہ ہو:

"ایک ہی پل میں اعتبار و اعتماد کی
دیواریں زمین بوس ہوئیں
صحرا میں ریت کے ذرے اڑنے لگے
سمندر کی گہرائی میں گہری ہلچل سی مچی
دل کی دھڑکنیں سینے سے ٹکرائیں کچھ اس طرح
آنکھوں کا غبار موتی تو بنا، پلکوں پہ ٹھہر سا گیا
بس اک آگ سی لگی تھی دل میں
یہ کیسی محبت تھی میری، جس کا یہ صلہ ملا
یہ بے بسی کبھی پہلے نہ دیکھی تھی" (24)

امیری غریبی اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کی آزمائش کے لیے آتی ہے۔ امیر بنا کر رب کریم کچھ لوگوں کو آزمائش کی کسوٹی پر کھڑا کر دیتا ہے۔ اسی طرح غربت کے ذریعے لوگوں کو آزماتا ہے کہ رتبہ تو میں نے اسے اشرف المخلوقات ہونے کا دیا ہے۔ تو کیا اس ابن آدم، کے اندر صبر کا مادہ موجود ہے یا نہیں، وہ اس غریبی کے حالات میں ہی میرا شکر گزار بنتا ہے یا نہیں، ہر دونوں صورتوں میں امیری اور غریبی صرف انسان کی آزمائش کے لیے ہے۔ کیونکہ وہ رب ذوالجلال انسان کو دونوں طریقوں سے آزماتا ہے۔

☆ مال و دولت دے کر بھی آزماتا ہے۔
☆ روپیہ پیسہ چھین کر یا قلت دے کر بھی آزماتا ہے۔

موجودہ زمانے میں سب سے بڑا المیہ دکھ اور غربت و افلاس ہے۔غربت و افلاس نے معاشرے کی سوچ وفکر اور عمل پر سنگین نتائج مرتب کئے ہیں۔غربت کی وجہ سے معاشرے کی بنیادیں کھوکھلی ہوگئی ہیں۔غربت وافلاس نے لوگوں کے ذہنوں سے بے حسی،خودغرضی، بے ایمانی، حرص ولالچ،طمع،اور پیٹ کی بھوک کو بھرنے کے لیے حرام اور حلال کا امتیاز بھلا دیا ہے۔لوگ پیٹ کا ایندھن بھرنے کے لیے حلال کو بھول کر حرام کے ذریعے ہی اپنی اور اپنے خاندان کی کفالت کو پورا کرنے کی کوششوں میں سرگرداں ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کو چاہنے کے باوجود معاشرے سے نکالا نہیں جا سکتا۔ پیٹ کی بھوک نے سماج کے لوگوں کو اندر سے کھوکھلا اور بے ضمیر بنا دیا ہے۔ وہ شاعر ہی کیا جو درد دل نہ رکھتا ہو اور اسے سماج کے لوگوں کے دکھ درد سے آگاہی نہ ہو،لیکن فرخندہ رضوی ایک انسان دوست شاعرہ ہیں وہ معاشرے کے دکھی لوگوں کو دیکھ کر کڑھتی ہیں اور ان کے لیے دل میں بے پناہ ہمدردی اور پیار کا جذبہ رکھتی ہیں اور یہی درد دل کا احساس انہیں دوسرے شعرا سے انفرادیت بخشتا ہے:

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کر و بیاں

اور ایسا ہی درد دل ہماری پیاری شاعرہ فرخندہ رضوی کی رکھتی ہیں۔درد دل رکھنے والی فرخندہ رضوی کی آزاد نظم "انسانیت" میں دلوں کو موہ لینے کا انداز ملاحظہ ہو۔بقول فرخندہ رضوی:

"سچائی کے برش سے محبت کے
رنگوں کی آمیزش کی
کبھی نہ اترنے والا
اخلاق کا رنگ بکھیرا
پھر خلوص کی چاشنی
محبت،اخلاق اور درد دل
کے ملانے سے
خوبصورت تصویر مکمل ہوئی

میں نے دل کے نہاں خانے میں
چھپی۔۔۔۔۔۔۔۔
اس تخلیق کا نام
انسانیت رکھ دیا"(25)

زندگی اللہ تبارک وتعالی کا خوبصورت تحفہ ہے۔ ہر ادیب اور شاعر شاعری کرتے ہوئے اپنے اپنے نقطہ نظر سے معاشرے کی عکاسی کو اپنی بساط کے مطابق پیش کرنے کی سعی کرتا ہے۔ انسان اور انسانیت اور خصوصا معاشرے کا تجزیہ کر کے اپنی اپنی آرا قائم کر کے اپنی شاعری میں خوش اسلوبی کا پہناوا پہنا کر بیان کرتے ہیں۔ زندگی کا فلسفہ بڑا عجیب ہے۔ کچھ کے نزدیک نعمت اور رحمت ہے اور کچھ کے نزدیک عذاب و زحمت کے مشابہ ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے امتحان قرار دیا ہے اور کچھ لوگوں کے خیال میں یہ غم کا پیش خیمہ ہے۔ جو لوگ زندگی کی رعنائیوں و آسائشوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں ان کے لیے یہ دنیا جنت کے مشابہ ہے اور جو لوگ زندگی کو غربت و افلاس، بھوک اور معاشرے کی ناہمواری کی چکی میں پس کر گزار رہے ہیں ان کے لیے یہ عذاب اور عقوبت خانہ کی مانند ہے۔ یہ زندگی ہے یہاں کچھ لوگ سبق دے جاتے ہیں اور کچھ سبق حاصل کر لیتے ہیں اور اس حقیقت سے کسی بھی طور انکار ممکن نہیں ہے۔ بقول ڈاکٹر یوسف حسین خان:

" جدید زمانے کا انسان آج اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی
جس منزل میں ہے وہاں وہ سوچ رہا ہے کہ آیا زندگی اس قابل
ہے کہ زندہ رہا جائے اس میں ایک عجیب جھنجھلاہٹ، الجھن اور
بے زاری کی کیفیت پائی جاتی ہے فرد اپنی شناخت کھو چکا ہے۔
قدروں کا احترام اٹھ گیا ہے"(26)

غربت و افلاس انسان کو بڑے بڑے سبق دیتے ہیں۔ اپنے پرائے کی پہچان کرواتی ہے۔ اچھے برے رویوں کی سمجھ آجاتی ہے۔ انسان اپنی قدر و قیمت کھو دیتا ہے۔ امیر اپنے غریب رشتے داروں سے میل ملاپ نہیں رکھتے کہ کہیں غریب ہم سے کچھ مانگ نہ لیں۔ لوگوں کی بے حسی اور خود غرضی کو فرخندہ رضوی اس طرح بیان کرتی ہیں۔ بقول احمد ساقی:

اک لقمہ حیات پر بہنے لگا لہو
انسان اپنے عہد کے سفاک ہو گئے

(27)

اچھے شاعر کی کامیابی کا راز ہی یہی ہے کہ اپنے محسوسات واحساسات کو منفرد طریقے سے دنیا میں متعارف کروائے۔ شاعری دنیا کو ایک نئے طریقے سے دیکھتی ہے۔ ہر لکھا جانے والا لفظ جو ہمیں زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں سے آشنا کرتا ہے۔ ہر شاعر کا اپنا انداز فکر ہوتا ہے۔ جس کا استعمال وہ اپنی شاعری میں کرتا ہے۔

فرخندہ رضوی بھی ایک باضمیر اور حساس طبعیت کی مالک خوبصورت شکل وصورت، انسانیت کا درد محسوس کرنے والی شخصیت ہیں۔ وہ معاشرے کے ہر فرد کے مسائل کے حوالے سے دلی ہمدردی رکھتی ہیں۔ یہ ان کی انسانی نفسیات پر مکمل عبور کی دلیل ہے۔ بقول فرخندہ رضوی:

اس شہر کی بلند عمارات کے قرین
ہر جھونپڑی میں درد کی ماری ہے زندگی

(28)

فرخندہ رضوی نے زوال پذیر معاشرے کی عکاسی اور زندگی کے مصائب ومسائل سے آگہی، غربت کے مارے لوگوں بھوک، ضروریات پورا نہ ہونا اور ذلالت بھری زندگی کا مشاہدہ اتنا قریب سے کیا ہے کہ وہ غریبوں کی حرکات وسکنات کو دیکھ کر فوری ان کے دل کی بات سمجھ جاتی ہیں اور یہ ہر شاعر کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ وہ نہایت سہل لہجے میں گہری بات دوسروں تک پہنچانے کا فن بخوبی جانتی ہیں جیسے یہ شعر:

اکڑ کر دیکھتی تھی میں گلی میں جس بھکارن کو
ترستی آنکھ سے وہ دیکھ کر تڑپا گئی مجھ کو

(29)

یاد سماج کا ایک اہم پہلو ہے۔ سماج میں رہنے والے انسان خوشی اور غمی کے مواقع کو یاد بنا کر ساری زندگی گزرے ہوئے لمحات کو یاد کے سہارے گزارتے ہیں۔ یاد ان کی زندگی کا قیمتی سرمایہ

ہوتی ہے۔خصوصاً خوشی کے مواقع پر اور عاشق کا اپنے محبوب کی یادوں میں کھوئے رہنا۔

یادکو شاعری کا اہم ترین موضوع سمجھا جاتا ہے۔انسانی زندگی کے اتار چڑھاؤ، تلخ وشیریں حقائق ،محبت میں ناکامی، محبوب کی بیوفائی، اولاد کا غم وغیرہ وغیرہ ایسی یادوں کی برات کا ساتھ انسان چاہتے ہوئے بھی بھلا نہیں سکتا ہے۔یادیں انسان کی تنہائی کا ایسا سہارا ہیں کہ تنہائی میں بھی محفل کا سماں برپا ہوجاتا ہے۔انسان تخیل وتصور میں ماضی میں پہنچ کر اسی یاد کے مطابق وہ نہیں سوچ رہا ہوتا ہے مجسم صورت میں رول کرنے لگتا ہے۔رات کو چونکہ انسان ہر کام سے فارغ ہوجاتا ہے۔ماحول پرسکون ہوتا ہے تو یاد بھی یادوں کی برات کے ساتھ آن وارد ہوتی ہے۔یادیں رلاتی بھی ہیں اور ہنساتی بھی، یادیں خوشی بھی دیتی ہیں پرانے غموں کو ہوا بھی دیتی ہیں۔گزرے وقت کے مناظر تخلیق کر کے آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔

یادیں بڑی حسین ہوتی ہیں۔یہ زندگی کا اہم سرمایہ ہوتی ہیں۔یہ جس قدر پرانی ہوتی جاتی ہیں۔انسان کے لیے ان کی اہمیت وافادیت بڑھتی جاتی ہے۔شاعر وہ شخصیت ہوتا ہے جو ان یادوں کو شعری تسبیح میں پرو کر محفوظ کر لیتا ہے۔یادیں وہ سرمایہ ہیں جن سے کسی صورت بھی پیچھا نہیں چھڑایا جاسکتا۔فرخندہ رضوی اپنی نظم "یاد" کے آئینے میں۔فرخندہ رضوی اپنے ماضی کی یادوں کو کیسے یاد کرتی ہیں۔ملاحظہ ہوا:

" آئی تھی اس خیال سے۔
سوؤں گی تجھ سے چھپ کر مگر
ہر سلوٹ پر یادیں تھیں تیری
ہر کروٹ میں محسوس ہوا تیرا پہلو۔۔۔
رات بھر سوئی ہی کہاں
اس اندھیرے سے صبح کے اجالے تک
ہر سلوٹ میں تجھے
ڈھونڈتی ہی رہی میں (30)

یادیں فرخندہ رضوی کے نزدیک قیمتی خزانے سے کم نہیں ہیں۔انھوں نے زیرنظر دونوں

شعری مجموعوں "سنو خموشی کی داستان" اور "فاصلے ستارے ہیں" میں بہت زیادہ شاعری یادوں کی سنگت میں کی ہے۔ انھوں نے تخیلاتی اور فکری طور پر کافی جہتوں میں اشعار کہے ہیں۔ جس میں ایک طرز فکر یاد ماضی ہے۔ بعض اوقات کسی کی یاد دل میں اس قدر بسیرا کر لیتی ہے کہ انسان یادوں کے سہارے ملاقات کا سرور حاصل کر لیتا ہے۔ فرخندہ رضوی سماجی تناظر میں ''یاد'' کے موضوع کو شعروں میں اس طرح پیش کرتی ہیں:

روز ہی روز سینے سے لگائے پھرتی ہوں یادوں کو
بچھڑ گئی تجھ سے اک بار تو پھر جاؤں گی کہاں

(30)

فرخندہ رضوی یادوں کی برات سے راہ فرار چاہتی ہیں مگر یادیں ہیں کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتی اس اذیت و کرب کے لمحوں میں فرخندہ بے اختیار پکار اٹھتی ہیں:

میں سلگنا نہیں چاہتی آتش محبت میں
کہو دل ذرا ٹھہرے کہیں یادیں نہ جلا دیں مجھ کو

(31)

سماج کے جہاں اور کئی پہلو ہیں، وہاں ظلم و ستم بھی سماج ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ کسی کو اس کے حقیقی حق سے محروم کرنا ظلم و ستم کے زمرے میں آتا ہے۔ ظلم کی حد تو یہ ہے کہ نہ صرف حق سے محروم کیا جاتا ہے۔ بلکہ الٹا مجرم بھی ثابت کر دیا جاتا ہے۔ اکثر اوقات ظلم کی ابتدا کسی چھوٹی سی ناانصافی سے شروع ہو کر حقوق کی پامالی تک جا پہنچتی ہے۔ ہر بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ صاحب اختیار لوگ ہمیشہ ہی غریبوں اور مجبوروں پر ظلم اور ناانصافی کے پہاڑ ڈھاتے ہیں۔ انہیں اذیت و تکلیف دینے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔ زندگی کا دستور ہے کہ زیست کے تمام شعبوں میں غریب اور مجبور ظلم سہتا ہے۔ صنعت کار ہو یا زمیندار، سرمایہ دار ہو یا سیاست دان سب اپنے طریقوں سے غریبوں کو استعمال کرتے ہیں۔ دن رات ان سے کام لیا جاتا ہے۔ مگر ان کے کام کا معاوضہ اور اجرت برائے نام دی جاتی ہے۔ نتیجہ امیر اور امیر ہوتا جاتا ہے اور غریب بعض اوقات ظلم

وستم کی بدولت اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور یہ سب کچھ ہمارے سماج میں روز اول سے ہو رہا ہے اور شاید ہمارا سماج ظلم وستم کی اس وبا سے آخری وقت تک بھی چھٹکارہ نہ پا سکے۔

معاشرے کے اکثر لوگ ایسے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں اور یہ مصائب ومسائل اس قدر پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ لوگ اپنے حق کے لیے آواز اٹھانا بھول گئے ہیں۔ کیونکہ وہ نہ صرف جسمانی طور پر ان کے غلام ہوتے ہیں بلکہ ذہنی طور پر بھی اس طبقے کے تابع ہوتے ہیں اور یہ سماج کا ادنی ترین طبقہ ہوتا ہے۔

فرخندہ رضوی چونکہ معاشرے کی سچی تصویر پیش کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے وہ معاشرے کی سچی عکاسی کرتے ہوئے جو کچھ معاشرے کی ناہمواریوں کو دیکھتی ہیں۔ اسے اپنے فن وفکر کے ذریعے بے چون وچرا پیش کر دیتی ہیں۔ بقول شہزاد احمد:.

> ''فرخندہ رضوی صاحبہ جدید، مؤثر اور تازہ وتوانا لہجے کی شاعرہ ہیں۔ اچھا شعر کہنے کا جذبہ رکھتی ہیں مگر طبعیت کا زیادہ تر میلان " آزاد شاعری" کی جانب ہے۔ اپنی بات نہایت سلیقہ سے کہتی ہیں انداز بے شک دھیما ہے مگر اپنے ماضی الضمیر کو پوری توانائی سے منتقل کرنے کے فن سے بخوبی واقف ہیں'' (32)

معاشرے کے مسائل کو دوسرے لوگ آنکھیں بند کر کے گزر جاتے ہیں۔ مگر شاعر اس مقام پر خاموش نہیں رہتا بلکہ اس اجتماعی دکھ کو اپنی شاعری کے ذریعے بیان کرنا اپنا اولین فرض سمجھتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا رہتا ہے۔ شاعر یہاں اپنی بات کو منطق یا دلائل کے ذریعے نہیں کرتا بلک وہ جذبات کا سہارا لیتا ہے۔ یہ جذباتیت شاعری کو اثر پذیری عطا کرتی ہے جس سے اشعار ذہن کی بجائے سیدھا دل پر اثر کرتا ہے۔ آرزوؤں کا ناکام رہنا بھی پریشانی کا باعث بنتا ہے جب پوری توجہ خواہشات کے ادھورے پن کا شکار ہو جائے تو یہ دکھ اجتماعی دکھ کی

صورت اختیار کر لیتا ہے۔ بقول احمد ساقی:

وہ ظالم میری کمزوری پہ رکھتا ہے نظر اپنی
جہاں پر زخم ہوتا ہے وہیں پر وار کرتا ہے

(33)

ظالم جتنا مرضی ظلم وستم کا بازار گرم کر لے، بالآخر ایک دن اس کو پکڑا جانا ہے۔ ظلم جب حد سے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔۔ ظالم کی رسی جتنی مرضی ڈھیلی کر دی جائے مگر جب مکافات عمل شروع ہوتا ہے تو وہی ڈھیلی رسی اس کے گلے کا پھندا بن جاتی ہے۔ انہی تکلیف دہ حالات و مصائب میں بھی فرخندہ یہ کہتی نظر آتی ہیں:

اہل ذر سے بھی رابطہ رکھنا
درمیاں میں مگر انا رکھنا
وقت کیسا بھی آپڑے تم پر
زندگی سے نہ تم گلہ رکھنا

(34)

سماج میں لوگوں کے ہجوم میں بہت سے لوگ مختلف شعبوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ کوئی ڈاکٹر، کوئی وکیل، کوئی استاد کوئی شاعر و ادیب۔ یہاں ہم بات شاعری کے حوالے سے کر رہے ہیں تو ہمارا معاشرہ اچھے شاعروں اور شاعرات سے بھرا پڑا ہے۔ شاعر لوگ ملک اور سماج کا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔ شاعر ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے شاعری ایک پیچیدہ کام ہے۔ بہترین خیالات کو بہترین الفاظ سے مزین کر کے بہترین انداز سے ہی کرنا بڑے فن کی بات ہے۔ درحقیقت شاعری نے بڑے بڑے کام سرانجام دیے ہیں۔ اور شاعری سے بڑے بڑے کام لیے بھی جاتے ہیں اور لیے بھی جا رہے ہیں۔ شاعر دلوں اور روحوں کا ترجمان ہوتا ہے۔ شاعر کی شاعری کا معیار جس قدر بلند ہوگا۔ اسی قدر وہ مقاصد بھی بڑے رکھے گا۔ بقول احمد ساقی:

" آج کل شاعروں کا جمعہ بازار لگا ہے۔ ہر کوئی شاعری کر رہا ہے اور اپنے آپ کو بڑا شاعر ثابت کرتا پھرتا ہے جب کہ کسی کے شاعر ہونے یا نہ ہونے، کسی شاعر کا معیار کیا ہے؟ اس کا فیصلہ تو وقت ہی کرتا ہے"(35)

فرخندہ رضوی کے نزدیک شاعری کا فن پیچیدہ اور مشکل ترین کام ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ شاعری دل کی کیفیت ہے جو دل پر اثر کرتی ہے۔ اگر شعر لوگوں کے دلوں میں تاثیر نہ چھوڑے ایسی شاعری کا کیا فائدہ۔ بقول فرخندہ رضوی:

" کہتے ہیں کہ تحریر ادب اس وقت بنتی ہے۔ جب خوبصورت احساس شامل ہوں۔ اس میں لکھنے والا اپنی تحریر کو خون جگر سے سجاتا ہے۔ اس کی خوش قسمتی یا بد قسمتی اس وقت سامنے آتی ہے کہ پڑھنے والا کہاں تک سمجھ پایا"(36)

ہجرت کے لغوی معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کے ہیں۔ اصطلاحی طور پر اللہ کی رضا کی خاطر اپنے گھر بار اور وطن کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلے جانا ہجرت کہلاتا ہے۔ قیام پاکستان کے وقت بھی تاریخ کی بہت بڑی ہجرت ہوئی۔

فرخندہ رضوی چونکہ عرصہ دراز سے بیرون ملک رہ رہی ہیں۔ اس لیے ان کے کلام میں جا بجا ہجرت کا موضوع ملتا ہے۔ فرخندہ رضوی اپنے ملک سے دوسرے ملک جانے کو اپنے لیے مفید سمجھتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہجرت انسان کو بہت فوائد سے نوازتی ہے۔ اگرچہ آسان مرحلہ نہیں بلکہ بہت مشکل کام ہے۔ ہجرت بہت سے مسائل پیدا کرتی ہے۔ مگر جب انسان ہجرت کرتا ہے تو اس کے فوائد بھی ہوتے ہیں اور اکثر ہجرت کرنے والے لوگ کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔ پردیس میں اپنے دیس کی باتیں اور یادیں انسان کے ساتھ ہمیشہ رہتی ہیں۔ ہجرت کا دکھ کبھی ہنساتا اور کبھی رلاتا ہے۔ انسان کبھی شہرت، کبھی عزت اور کبھی مال و دولت حاصل کرنے کے لئے بھی یہ دکھ اٹھاتا ہے۔

یہ بھی سماج کا ایک اہم پہلو ہے۔ بقول فرخندہ رضوی:

"مجھے نہیں لگتا کہ میں اپنے شہر میں ہوتی تو شاید اتنی شہرت نہ ملتی۔۔۔۔ اور دوسری بات یہ کہ جہاں عزت ملنی ہوتی ہے وہاں مل کر رہتی ہے۔۔۔ جب وہاں تھی لکھتی تھی مگر کوئی جانتا نہیں تھا۔ یہاں آئی تو قلم کی طاقت جب بڑھی۔ مجھے راستے ملتے گئے میری اپنی ایک پہچان بنتی گئی"(37)

فرخندہ رضوی پردیس کو عارضی ٹھکانہ تصور کرتی ہیں اور اپنے وطن کو حقیقی پناہ گاہ سمجھتی ہیں۔ پردیس کی زندگی انتہائی کرب آمیز اور تنہائی پسند ہوتی ہے۔ نہ اپنے خونی رشتے اور نہ دوست احباب ہوتے ہیں۔ جن سے زندگی کے دکھ سکھ کو بانٹا جا سکے۔ مذہبی اقدار کی پاسداری کرنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔ مذہبی آزادی سلب ہو جاتی ہے۔ مغرب کے ننگ تڑنگ ماحول میں خود کو بچا کر پاکیزہ زندگی گزارنی مشکل ترین ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں فرخندہ شعروں میں یوں کہتی ہیں:

میری خواہشیں مجھ کو یہ کہاں پر لے آئیں
ہے برہنگی ہر سو ، ہرسو بے لباسی ہے
(38)

اپنے آپ کی خود تعریف کرنا یعنی اپنے منہ میاں مٹھو بننا۔ دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سننا اور خوش ہونا خود پسندی کے زمرے میں آتا ہے۔ داد تحسین سب کو بھاتی ہے۔ جو ایک مرض کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ کسی نہ کسی بہانے، وسیلے سے موقع تلاش کرنا کہ کوئی تعریف کرے اور پھر دوسروں کی تعریف پر پھولے نہ سمانا خود پسندی ہے۔ اکثر اوقات خود پسندی انا پرستی میں بدل جاتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انا پنی اور خود پسندی ہر انسان میں موجود ہوتی ہے۔ یہ مختلف لوگوں میں مختلف طرح سے ہو سکتی ہے۔ مثلاً دولت منداور امیر طبقہ میں دولت کی فراوانی ہمیں خود پسند بنا دیتی ہے۔ اسی طرح علماء وفضلاء حضرات میں اپنے علم کی وجہ سے خود پسندی پیدا ہو جاتی ہے۔

بڑے بڑے شاعر نئے آنے والے شعرا کے کلام کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے اور خود پسندی کے زعم میں نئے شعرا کے کلام کی اصلاح سازی سیگریز کرنے نظر آتے ہیں۔خود پسندی کا زعم بھی ہمارے معاشرے کا ایک افسوسناک پہلو ہے۔فرخندہ رضوی اپنے شعری مجموعے'' خوشبوئے خندہ'' کی اصلاح سازی کے لیے معروف شاعر کی خود پسندی کے ضمن میں لکھتی ہیں:

" کچھ ناموں میں ایک نام غلام ماجدی صاحب کا جو ادب کی دنیا میں شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں مری کتاب پر لکھنے کو فخر سمجھا، کتاب کا کچھ مسودہ قبول کیا پھر تین ماہ کی خاموشی کے بعد جواب آیا، میں نیا شاعر نہیں ہوں (مگر دیکھا جائے تو مشاعرے۔۔۔۔ میں پائے جاتے ہیں) میں تعریفی مضمون نہیں لکھ سکتا۔مگر بخدا میں نے کبھی نہیں چاہا کہ کوئی۔۔۔۔ تعریف لکھے "(39)

خود پسندی کا نشہ جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو پھر یہ تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب انسان خود کو افضل و اعلیٰ سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔تو اپنی برتری و بڑائی قائم رکھنے کے لیے جائز و ناجائز طریقے استعمال کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو سے کھیلنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔مقبوضہ کشمیر اس خود پسندی کی زندہ مثال ہے۔ بڑے بڑے ممالک اپنے مفاد اور سواد کی خاطر چھوٹے ملکوں میں جنگ کا بازار گرم رکھتے ہیں جس کی وجہ سے بے گناہ لاکھوں کروڑوں لوگ متاثر ہو کر تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ جب انا پرستی اور خود پرستی حد سے بڑھتی ہے تو یہ ہوس و حرص کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور یہ سب کچھ ہمارے سماج کا سنگین پہلو ہے اور اس حقیقت سے انکار نہ میں کر سکتی ہوں اور نہ کوئی سماج کا ٹھیکیدار کر سکتا ہے۔ فرخندہ رضوی شدت پسندی کو کچھ یوں بیان کرتی ہیں:

غمزدہ ہوں کہ میری آنکھوں نے
باغ امید جلتے دیکھا ہے

ہم نے اہل ہوس کو اے خندہ
کیسے کلیاں مسلتے دیکھا ہے

(40)

زندگی اللہ تعالی کا ایک حسین تحفہ عظیم ہے۔ ہر شاعر، ادیب نے زندگی کو اپنے اپنے نقطہ نظر سے دیکھ کر اپنی آراء قائم کی ہیں۔ زندگی کچھ لوگوں کے لیے باعث نعمت اور رحمت ہے۔ بعض لوگ اسے امتحان قرار دیتے ہیں تو کچھ زندگی کو غموں کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں۔ دنیا میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں۔ اچھے بھی برے بھی۔ کچھ لوگ زندگی سے سبق سیکھتے ہیں اور نیک عمل سے زندگی کو خوشگوار بنا لیتے ہیں اور کچھ زندگی کی رعنائیوں میں کھو کر گناہوں کے عمیق گڑھوں میں دھنس کر تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے زندگی اور اس کی حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔ زندگی اور شاعری کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے۔ کیونکہ شاعر کی شاعری میں زندگی کے ان تمام رویوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے جن کا بنیادی تعلق انسانی زندگی سے ہے۔ اور یہ وہ انسان ہے جو سماج کا ایک اہم حصہ ہے۔ یہ زندگی ہے صاحب الجھے گی نہیں تو سلجھے گی کیسے؟ بکھرے گی نہیں تو نکھرے گی کیسے؟

زندگی دراصل ایک امتحان گاہ ہے اور انسان تمام زندگی مختلف طرح کے امتحانات دیتا رہتا ہے۔ زندگی ایک سراب ہے۔ انسان ساری زندگی اس کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے۔ زندگی کبھی آنسوؤں سے نہلاتی ہے تو کبھی شبنم سی ہنساتی ہے۔ کہیں نرم کبھی گرم کہیں خوشی کبھی غم، کبھی ملن کبھی جدائی، کبھی صنم کبھی ہرجائی، یہ سارے نام زندگی کے ہیں مگر ایک عاشق کے لیے زندگی صرف اس کا محبوب ہوتا ہے:

"زندگی کا ہر لمحہ تمہارے نام
ہر اس راہ سے گزری ہوں
جو تیری راہ سے گزری ہے
تیرے ہونٹوں کو چھو کر

دل میں اتری ہوں ہر دھڑکن میں
بس گئی ہوں
ان فاصلوں سے بھاگتی ہوں جو ہر پل
درمیان میں آ بستے ہیں
سمیٹ لو مجھے بانہوں میں
یہ فاصلے تباہی ہیں''(41)

شاعری ایک پیچیدہ اور منفرد عمل کی حامل ہے۔جس کی تعمیر وتشکیل میں بہت سے عناصر کارفرما نظر آتے ہیں۔ جو ایک مربوط طریقہ سے آپس میں جڑے ہوتے ہیں درحقیقت شعر کی خوبصورتی اور اچھوتا پن یہی اکائی اور وحدت ہے۔شاعری کے دو عناصر ترا کیبی ہیں۔ پہلا عنصر فکری اور دوسرا عنصر فنی ہے۔فکر میں تخیل اور تشکیل کے نام ذرائع (جذبہ، تعمل، مشاہدہ، تجربہ) شامل ہوتے ہیں۔جب کہ فنی میں شعر کی تکنیک، ہئیت اور آہنگ شامل ہوتے ہیں۔

شاعری محض مختلف الفاظ وخیالات کو ایک جگہ جمع کرنا نہیں ہے بلکہ ان کو اس طرح پیش کرنا ہے کہ ابلاغ کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی خوبی کے ذریعے قاری کو لطف وآفرین کا احساس ہو۔ بلندی خیال کے ساتھ ساتھ اظہار بیان کی اہمیت بھی مسلم ہے۔کیونکہ جب تک اظہار بیان کا سلیقہ نہ ہو تو اظہار بیان میں شائستگی، سلاست تازگی، چستی بندش، بے ساختگی اور لطف بیان جیسی خصوصیات شامل نہیں ہوسکتیں اور کلام سخن پر تاثیر نہیں بن سکتا۔

ہر شاعر کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ اپنے طرز بیان کے حوالے سے وہ اپنی کاوش کو منفرد اور جداگانہ انداز بیان کی بدولت اس کی شناخت قائم کروائے اور یہی کشش شاعر کے کلام میں فنی پختگی لانے کا سبب بنتی ہے۔ ہر فنی پختگی جہد مسلسل کے سبب کسی بھی شاعر کے کلام کا خاصہ بن جاتی ہے۔

شاعر اپنی شاعری کو پر اثر اور قابل توجہ بنانے کے لیے نئے نئے تجربات کرتا ہے۔ یہ تجربات وکاوش بھی اسلوب کی انفرادیت قائم کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ بات روز

روشن کی طرح واضح ہے کہ نقاد حضرات کسی بھی شاعر کے تخیل اور تصور کے ساتھ ساتھ انداز بیان اور اسلوب کی بنا پر منفرد درجہ دیتے ہیں۔ دراصل کوئی بھی ادبی فن پارہ اس وقت تک پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا جب تک بلند تخیل کے ساتھ زبان و بیان کی چاشنی کا رنگ شامل کلام نہ ہو۔ شاعر قافیہ ردیف کی انفرادیت، استفیامیہ لہجہ۔ بحروں کا استعمال اور ترنم وغنائیت سے اپنے کلام کو سنوارے سجائے۔ ادبی شہ پارے کے حوالے سے لونجائنس درج ذیل خصوصیات کو لازم قرار دیے ہیں:

"عظمت خیال (Thought of Grandeur) شدید
قومی جذبہ تاثیر (Spirited and Regarour) منائع
بدائع (لفظی و معنوی) کا استعمال، پرو قار زبان کا استعمال یا
انتخاب الفاظ یعنی مناسب الفاظ کا انتخاب، موزوں اور برمحل
استعاروں کا استعمال، موثر اور پراثر شوکت ترتیب اور ہیتی
ساخت (of Elevation and Majesty
(42)"(Structure

فرخندہ رضوی کی غزل فنی کا جائزہ لیا جائے تو ان کی غزل میں زبان و بیان کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ انہوں نے منفرد اسلوب کے ذریعے اپنی انفرادیت اور خوشنمائی کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔ ان کی غزل میں قافیہ ردیف کی انفرادیت، بحروں کا استعمال، علم عروض اور مروجہ اردو بحور کا استعمال اپنی شاعری میں دکھانے کی پوری کاوش کی ہے۔ بقول سلطانہ مہر:

"فرخندہ رضوی بھی سفری راہوں پر اسی طرح اپنے پیر جمانے کی
کوششوں میں مصروف ہے۔ اسکا کوئی استاد نہیں۔ ان لڑکیوں
اور خواتین کی حوصلہ افزائی کی جو قلم کی شیدائی تھیں۔ اردو زبان
وادب کی دلدادہ تھیں۔ مجھے فخر ہے کہ ان میں کئی آج کی جانی
پہچانی اور معتبر شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔ فرخندہ رضوی بھی انہی میں

سے ایک ہیں، آج وہ ایک نو آموز بچے کی طرح چلنا سیکھ رہی ہے"(43)

کسی بھی شاعر کے کلام میں زبان و بیان کی چاشنی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ زبان و بیان کے خوبصورت استعمال سے کلام پرکشش اور دلفریب معلوم ہوتا ہے۔ فصاحت و بلاغت کی پاسداری، روزمرہ اور محاورہ کا برمحل استعمال، کلام میں زبان و بیان کے حوالے سے چاشنی کا سبب بنتے ہیں۔ فرخندہ رضوی کی زبان و بیان کی چاشنی ملاحظہ ہو:

نغموں کا ترنم، جھرنوں سی خموشی
ایسے دل میں اتر آیا کرو یوں
فاصلے سمیٹ کر پلکوں پر انتظار سجائے
روز گلے لگایا کرو یوں

(44)

مشہور شاعر دانتے زبان کے مسئلہ پر اپنی رائے کچھ یوں دیتے ہیں۔

" زبان کا مسئلہ ہر شاعر کے لیے خواہ اطالوی ہو یا فرانسیسی۔ یونانی ہو یا انگریزی، بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ادب میں ایک مخصوص زبان استعمال ہونی چاہیے اور یہ زبان روزمرہ سے قریب ہونی چاہیے لیکن اکھڑ، ناتراشیدہ اور دیہاتی زبان استعمال نہیں کرنی چاہئے یعنی گنواروں کی زبان سے پرہیز کرو"(45)

پاکیزگی خیال کے ساتھ ساتھ زبان کی صفائی بھی لازمی امر ہے فرخندہ رضوی زبان و بیان کی چاشنی روزمرہ اور محاورے کی تمام خوبیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ ان کا کمال خاص یہ ہے کہ وہ سماج میں بولی جانے والی زبان کا استعمال کرتی ہیں نہ کہ انگریزی زبان کے الفاظ کیونکہ وہ

گوروں کے شہر میں رہ کر اردو زبان کی آبیاری کر رہی ہیں۔ کلام سخن ملاحظہ ہو:

ہوائیں آج بھی گنگناتی ہیں چھو کر
اپنی آنکھوں سے نفرت کی چادر ہٹا کر تو دیکھو
سحر کی دھوپ میں ٹھنڈک سی ملے گی
اک بار کھلے آسمان کے نیچے آ کر تو دیکھو

(46)

انسان سماجی حیوان ہے کسی بھی ترقی اور کامیاب منزل تک پہنچنے کے لیے وہ سماج کا محتاج ہے۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اگر انسان ترقی کرنا چاہتا ہے تو اسے سماج میں آپس میں باہم مل جل کر رہنا ہوگا۔ کیونکہ سب سے اہم رشتہ انسانیت کا ہوتا ہے اگر انسان اس دھرتی کو امن اور خوشحالی کا گہوارہ بنانا چاہتا ہے تو اس کے لیے اسے تمام تعصّبات سے بالاتر ہو کر سوچنا پڑے گا۔ ایسی سوچ کی حمایت اور حوصلہ افزائی کرنا ہوگی۔ جو انسان کو انسان کے قریب لانے میں معاون و مددگار ثابت ہو۔

اچھی اور مثبت سوچ معاشرے کے باسیوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ سماج میں امن، یگانگت اور بھائی چارے کو فروغ دینے کے لیے ایسی ہی مثبت سوچ کی فرصت ہے۔ جو انسانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت پیدا کرے۔ فرخندہ رضوی انسانیت کی قائل شاعرہ ہیں وہ طبقہ بازی کے خلاف ہیں ان کی سوچ کے مطابق انسان کو قدر و منزلت محض دولت کی بنا پر نہ ملے بلکہ اس کی صلاحیتوں کے بل بوتے پر ملے۔ انسان انسان کی قدر کرے ایک دوسرے کو احترام و محبت کی نگاہ سے دیکھے۔ بقول شہزاد احمد

"فرخندہ رضوی صاحبہ کی یہ تمام کوشش دیار غیر (انگلینڈ) میں بیٹھ کر قابل رشک اور قابل حد ستائش ہیں۔ وہ اس مشینی ملک میں رہتے ہیں جہاں کا ہر انسان ایک مشین بن چکا ہے۔ مگر وہ

اس کے باوجود انسان اور انسان دوستی کی علمبردار ہیں"(47)

فرخندہ رضوی ایک انسان دوست شاعرہ ہیں جو معاشرے کے بے یارو مددگار لوگوں کے دکھوں اور تکلیفوں پر نہ صرف کڑھتی ہیں بلکہ اپنے اشعار کے ذریعے ان کے دکھ درد کی تصویر کشی بھی کرتی ہیں۔ دور حاضر میں غربت وافلاس نے سماج کی سوچ وعمل میں سنگین نتائج پیدا کر کے انسان کی زندگی کو مشکلات سے دوچار کیا ہے۔ فاقہ کشی عروج پر ہے بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہے۔ غریب آدمی کا اچھے انداز میں زندگی گزارنا محال ہے۔ بقول فرخندہ رضوی:

"روک لو اس گھڑی کو
یہ لمحے اس طرح ٹھہر جائیں
نہ ٹھہرے تو۔۔۔۔۔۔
غضب ہو جائے گا
ہر طرف لاشے ہی لاشے بکھرے ہونگے"(48)

اگر کوئی سماج امن وسکون کا گہوارہ ہو تو وہاں خوف بھی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ اگر ہر طرف دہشت گردی، ڈاکہ زنی، قتل وغارت اور لوٹ مار کا بازار گرم ہو تو اس سماج کے لوگوں میں خوف و ہراس کا پیدا ہونا یقینی ہوتا ہے۔ خوف کی سب سے بڑی وجہ سے سماج میں بدامنی کی فضا ہے۔ لوگ ڈرے اور سہمے رہتے ہیں۔ جبکہ امن دلوں کو سکون اور اطمینان بخشتا ہے۔ لوگوں کے اندر اعتماد بحال کرتا ہے۔ خوف اور ڈر جب کہیں سماج میں بسیرا کر لیتا ہے تو وہاں مسکراہٹیں اور قہقہے کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ شہنائیاں روٹھ جاتی ہیں حتی کہ ڈھولک کی تھاپ بھی نوحہ خوانی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جب خوف و ہراس سماج کے لوگوں کے دلوں میں بیٹھ جاتا ہے تو یہ خوف ان کی صلاحیتوں کو دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے۔

جنوبی ایشیا میں مقبوضہ کشمیر اور مشرقِ وسطیٰ میں فلسطین، شام، یمن، ایران اور عراق اس خوف کی جیتی جاگتی مثالیں ہیں جس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ دراصل خوف زدہ سماج کے اندر انسانوں کی

صلاحیتیں دم توڑ جاتی ہیں۔ جہاں دوسرے تمام شعبہ ہائے زندگی کے علاوہ شاعر اور ادیب جو سماج کے عکاس ہوتے ہیں۔ ان کی تخلیقی صلاحیتیں جو صحت مند معاشرے کی مرہون منت ہوتی ہیں زنگ آلود ہو جاتی ہیں اس سلسلے میں میں ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

"ادب، فن اور اس کی تخلیق ایک صحت مندانہ ماحول کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ زندگی کی مثبت قدروں کی علمبردار ہوتی ہے۔ اس کا پودا صرف آزادی اور محبت کی فضا میں پنپتا اور پروان چڑھتا ہے۔ منافقت کا ماحول اس کے لیے زہر ہے۔ بے عملی کی فضا اس کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ بے عقلی اور جہالت اس کے لئے ایک ایسی بیماری ہے جس کا علاج ممکن نہیں" (49)

خوف انسان کی نس نس میں رچ بس جائے تو احساسات بڑی حد تک مفلوج ہو جاتے ہیں۔ خوف انسان سے سکھ چھین لیتا ہے۔ انسان کو سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے۔ سماج میں پائی جانے والی بے یقینی کی صورتحال لوگوں میں خوف و ہراس پیدا کرتی ہے۔

آج کے سیاسی دور نے جہاں انسان کو بے شمار سہولیات سے نوازا ہے وہیں اس کی زندگی میں اندیشوں اور وہموں نے بھی جگہ بنالی ہے۔ آج کی سائنسی دور نے اس انجانے حادثوں کی خبر دی ہے اور انسانی جان کو کوارزاں بنا دیا ہے۔ دور حاضر کے انسان کو جہاں سہولیات، آسائشات اور خوشحالی کا سکھ ملا ہے۔ وہاں جنگوں، دھماکوں اور حادثوں کا تحفہ بھی ملا ہے۔ شاعر جو سماج کا حساس دن انسان ہے۔ یہ خوف و ہراس شاعر حضرات کی زندگی پر اثر انداز ہو کر اس کے فن پارے کے ذریعے سماج پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ایسی صورتحال کی تصویر کشی فرخندہ رضوی یوں کرتی ہیں:

"روک لوں اس گھڑی کو
کیوں نہیں روک لیتے

کوئی تو سمجھائے دشمن مسلمان کو
کیوں اپنے مفادوں میں
استانوں کا ہاتھوں۔۔۔۔۔۔
انسانوں کا خون کرواتے ہیں
ایسے میں کاش
کوئی مسیحا آجائے
سر اٹھیں سجدوں سے تو اک
معجزہ ہو جائے۔۔
کاش!
یہ گھڑی رک سی جائے۔۔"(50)

جدائی کو شاعری کا اہم ترین موضوع تصور کیا جاتا ہے۔انسان چونکہ حیوان ناطق ہے۔اس کا ہر قول و فعل، زندگی کے نشیب و فراز، تلخ و شیریں حقائق، محبت، یادیں، ملن، جدائی سب سماج کی مرہون منت ہے۔سماج کا باسی ہونے کے ناطے وہ محبت بھی کرتا ہے نفرت کا بھی اسے حق ہوتا ہے۔ملن کے بعد جدائی بھی اس کی زندگی میں آسکتی ہے۔تمام لوگ تو نہیں مگر شاعر حضرات زندگی کے وہ تمام معاملات انسان سے تعلق رکھتے ہیں۔ان تعلقات کو موضوع بنا کر اپنے محسوسات و احساسات کو شعری پہناوا پہنا کر دنیا کے سامنے پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔وہ عموماً عشقِ و محبت، ملن و جدائی، یاد و تنہائی، محبت و نفرت، وفا و بے وفائی یہ سارے موضوع محبوب کے حوالے سے شعروں میں پیش کرتے ہیں۔

"جدائی" محبوب سے بھی ہوسکتی ہے، والدین سے بھی، بہن بھائیوں اور رشتہ داروں سے بھی ہوسکتی ہے۔محبوب سے لے کر رشتہ دار سب سماج کا حصہ ہیں۔فرخندہ رضوی نے جہاں سماجی بہت سے موضوعات کو اپنی شاعری میں سمویا ہے۔وہاں جدائی کو اپنی شاعری کا موضوع بنا کر کی

نظمیں اس پر لکھی ہیں۔ان کی نظم "جدائی" میں نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

"اس پیار کی خاطر
جدائی کے بعد۔۔۔۔
جانتے ہو کیسے۔۔۔۔۔؟
گزری ہے فرقت میں راتیں
ہجر کی جدائی کیا ہوتی ہے۔۔۔
کروٹ کروٹ یاد کیا ہے تجھکو۔۔
اس جدائی نے بے شک
مجھے تڑپایا ہے۔۔۔۔
بدر میں پھر ایک بار۔۔۔جدا ہونا چاہوں گا
اس پیار کو ساتھ رکھنے کی خاطر۔۔۔"(51)

فرخندہ رضوی نے بطور سماجی شاعرہ بہت سی غزلیں اور نظمیں جدائی کے موضوع پر لکھی ہیں۔ وہ سماج کی خیر خواہ شہری ہونے کے ناطے محبوب سے کچھ گلہ کرتی ہیں:

فضاؤں میں رچنے لگی ہے جدائی کی مہک پھر
کیوں ہو جاتے ہو جدا پھر مل لے اک بار
(52)

سادگی اور منفرد انداز بیان سے مراد کلام سخن سادہ زبان اور شعرا نفرادیت کے حامل ہونا ہے۔فرخندہ رضوی نہایت سادہ زبان کا استعمال کرتیہیں اور شاعری میں مقامی زبان کے استعمال سے اپنے اسلوب کو منفرد اور جاندار بناتی ہیں۔اپنے ہم عصر شعرا میں نمایاں حیثیت سے ابھر کر سامنے آئیں ہیں۔وہ فلسفیانہ افکار کا پرچار نہیں کرتیں۔ وہ بحیثیت سماجی شاعرہ اپنی شاعری کو سادہ اور مقامی الفاظ کے پہناوے میں پیش کرتی ہیں۔بقول فرخندہ رضوی:

" کہتے ہیں تحریر ادب اس وقت بنتی ہے جب خوبصورت
احساس شامل ہوں اس میں کوئی بھی لکھنے والا تحریر کو خون جگر
سے سجاتا ہے۔ میں نے ایک بار اپنی تحریر کے لیے مشکل،
بھاری بھرکم الفاظ کا چناؤ نہیں کیا"(53)

فرخندہ رضوی کی شاعری سادگی وسلامت کا مرقع ہے۔ وہ بھاری بھرکم الفاظ استعمال نہیں کرتیں بلکہ روزمرہ کے عام الفاظ کا استعمال کر کے انہیں مقامی رنگ عطا کرتی ہیں۔ جو عام سے عام قاری کو بھی سمجھ آجائے۔ جس طرح ہر انسان کے جذبات واحساسات دوسروں سے مختلف ہوتے ہیں بالکل اسی طرح ہر شاعر کی شخصیت اس کا کلام ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ جب کسی شاعر کی شخصیت کا عکس اس کی تحریروں میں دکھائی دینے لگتا ہے تو ناقدین انفرادیت کی بنا پر اسے صاحب اسلوب ماننے لگتے ہیں۔ یعنی الفاظ کا چناؤ شاعر کے قد کاٹھ اور معیار کو پرکھنے کا سبب بنتے ہیں۔ بقول مظہر سیفی:

" آسان اور عام فہم لفظوں اور لہجے میں بڑی بات کہہ جانے کا
فن شعر کی خوبیوں میں سرفہرست ٹھہرتا ہے۔ کچھ شعر بڑی
آسانی کے ساتھ چند سادہ لفظوں میں ایسی بڑی باتیں دو
مصروں میں کہہ جاتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے"(54)

سادگی کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

سحر کی دھوپ میں ٹھنڈک سی ملے گی
اک بار کھلے آسمان کے نیچے آکر دیکھو
(55)

چاند ازل سے دھرتی دھرتی، نگری نگری گھوم رہا ہے۔ ہر سماج نے چاند کو کئی ناموں سے نسبت دے رکھی ہے۔ سماج کی ہر ماں اپنے کالے کلوٹے، موٹے چھوٹے، نیلے پیلے بیٹے کو چاند کہہ کر پکارتی ہے۔ ہر عاشق اپنے محبوب کو چاند جیسا سمجھتا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ "دل آیا

گدھی پہ، پری کیا چیز ہے"

اپنے اپنے دل کی بات ہوتی ہے کیونکہ خوبصورتی تو دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔تبھی بے شک سماج کی نظر میں عشق کا محبوب خوب صورت نہ ہو مگر عاشق کے لیے وہ حور سے بھی زیادہ حسین ہوتا ہے۔ازل سے شاعروں اور ادیبوں نے چاند کو خوبصورتی کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔فرخندہ رضوی بھی سماجی رکن ہونے کی حیثیت سے اپنے محبوب کو چاند کا درجہ دیتی ہے۔ اپنی نظم "چاند تمہی تو ہو" میں محبوب سے یوں مخاطب ہیں:

"اپنی اک دنیا بسالی ہے میں نے
اس دنیا میں تم سے ملتی ہوں
میری دنیا کے ایک چاند تمہی تو ہو
بس یہ کہتی ہوں پھر۔۔۔
کبھی دل سے نکل کر سامنے آؤ تو۔۔۔۔"(56)

ایک اور جگہ فرخندہ رضوی محبوب سے گلہ زاری کرتی ہوئی کہتی ہیں:

چاند خوبصورت ہے ایک داغ کے ساتھ
تم بھی پیاری ہو بے وفائی کے ساتھ
(57)

دنیا کے ہر سماج کے غریب اور نادار لوگوں کا قیمتی گہنا (زیور) آنسو ہے۔جب دل چاہا رولیا اور غموں کو ہلکا کر لیا۔آنسو سے سماج کی یاری پرانی ہے۔کبھی کبھار سماج کا اعلیٰ طبقہ بھی اس کے گہنے سے مستفید ہو جاتا ہے۔فرخندہ رضوی کی اکثر شاعری آنسوؤں سے لبریز نظر آتی ہے۔"آنسو" ان کی شاعری کا واقعی گہنا ہے۔جس کا استعمال وہ شعروں میں بکثرت کرتی رہتی ہیں۔فرخندہ رضوی نے اپنی نظم "آنسو" میں اپنے جذبات کا اظہار کچھ یوں کیا ہے:

"بارش برستی ہی گئی آنکھوں سے
اک موتی کو مٹھی میں سمیٹ لیا

میں نے
اس بوند میں ندامت تھی
خوشی سے خالی خالی
میرے ہاتھ کی ہتھیلی پر
پھر سے مچل رہا تھا
آنکھ میں سمانے کو"(58)

خواہشات ان آرزوؤں کا نام ہے جو سماج میں رہنے والے ہر فرد کے دل میں پیدا ہوتی ہیں۔خواہشوں کے محل تعمیر کرنے کا حق صرف امیر طبقہ ہی کو نہیں ہے بلکہ یہ ہر طبقہ اور ہر سماج کے مکینوں کا حقیقی حق ہے۔ چاہے اس حق کو تعبیر ملے یا نہ ملے۔خواہشات پر کوئی لگام نہیں لگ سکتی۔ محبوب سے ملنے کی تڑپ خواہش رکتی نہیں، وفا ملتی نہیں کے مترداف،نمونہ کلام ملاحظہ ہو!

" کبھی یوں بھی تو ہو۔۔
آسمان کی گود میں ستارے جیسے
تمہاری آغوش میں میرا سر ہو
بادل گلے ملیں تو
میرے آنسوؤں کی طرح برسیں
بارش کے قطروں کو زمین اور
میرے آنسوؤں کے لیے دامن تمھارا ہو"(59)

یہ وہ سمندر ہے جس کا کوئی پل نہیں ہوتا۔ یہ میلوں دور ٹھاٹھیں مارتا وہ سمندر ہے۔۔جس کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا۔فرخندہ رضوی معاشرے کے مسائل ومصائب کو عنوان دے کر شعروں کے ذریعے سامنے لانے کا اہم فریضہ ادا کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1-مولانا الطاف حسین حالؔی، مقدمہ شعروشاعری، علم وعرفان پبلی پبلشرز،، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص: 93

2-ممتاز الحق، ڈاکٹر، اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۷ء، ص: ۸۳

3-سلیم احمد، سنو خموشی کی داستان، آئیڈیل پبلی پبلشرز اردو بازار کراچی، 2002ء، ص: 4

4-نائلہ بٹ، ڈاکٹر، سنو خموشی کی داستان، ص 5

5-شہزاد احمد، مدیر حمد ونعت کراچی، فاصلے ستارے ہیں، یونائیٹڈ صابری پبلی کیشنز، کراچی، 2006ء، ص: 11

6- فرخندہ رضوی ناسا ستاربر: ۳۲ شہزاد اما مادر مردانت گرانی: 8

7-شہزاد احمد، مدیر، حمد ونعت، کراچی، ص: 8

8-سبط حسن، سخن در سخن، مکتبہ دانیال، کراچی، 1987ء، ص: 24

9-فرخندہ رضوی، فاصلے ستارے ہیں، ص: 15

10-ایضا، ص: 14

11-ایضا، ص: 14

12-فرخندہ رضوی، فاصلے ستارے ہیں، ص: 73

13- فرخندہ رضوی، سنو خموشی کی داستان، ص: 13

14-یوسف حسین، ڈاکٹر، اردو غزل، زاہد بشیر یز نٹرز، اردو بازار، لاہور، طبع اول ۱۹۵۲ء، ص: ۸۸۲

15-فرخند؟ رضوی، فاصلے ستارے ہیں، ص: 41

16-انور مسعود، اک دریچہ اک چراغ، دوست پبلی کیشنز، 2008ء، ص: 26

17-فرخند؟ رضوی، فاصلے ستارے ہیں، ص: 16

18-فاخرہ بتول، گلاب خوشبو بنا گیا، فن پبلی کیشرز، لاہور، 2004ء، ص: 54

19-مرزا اسد اللہ خان، غالب، دیوان غالب، نیئر اسد پرنٹرز لاہور، 2001ء، ص: 111

20-فرخند؟ رضوی، فاصلے ستارے ہیں، ص: 76

21-ایضا، ص: 56

22-فرخندہ رضوی، رابطہ ٹیلی فونک، یکم ستمبر 2021ء پاکستانی وقت، شام، 7:00 بجے

23-ایضاً

24-فرخندہ رضوی، سنوخموشی کی داستان، ص:4

25-ایضا، ص:175

26-یوسف حسین، ڈاکٹر، اردو غزل، ص:307

27-احمد ساقی، دروازہ، مکتبہ قدسیہ لاہور، جون، 2018، ص:135

28-فرخندہ رضوی، سنوخموشی کی داستان، ص:12

29-فرخندہ رضوی، زیر لب خندہ بزم تخلیق ادب کراچی پاکستان، 2012،، ص:25

30-فرخند؟ رضوی، فاصلے ستا رہے ہیں، ص:17

31-ایضا، ص:65

32-شہزاد احمد، فاصلے ستا رہے ہیں، یونائیٹڈ صابری پبلی کیشنز، مدیر، حمد و نعت، کراچی، جنوری 2006، ص:37

33-احمد ساقی، دروازہ، ص:58

34-فرخندہ رضوی، زیر لب خندہ بزم تخلیق ادب کراچی پاکستان، 2012،، ص:25

35-احمد ساقی، دروازہ، ص:135

36-فرخندہ رضوی، قلم خندہ، ورلڈ پنجابی فورم، پاکستان، 2015، ص:238

37-فرخندہ رضوی، رابطہ ٹیلی فونک، 10 ستمبر 2021ء پاکستانی وقت، شام، 00:6 بجے

38-فرخندہ رضوی، خوشبوئے خندہ، ص:59

39-پیش لفظ، ص: 13

40-فرخندہ رضوی، زیر لب خندہ بزم تخلیق ادب کراچی پاکستان، 2012،، ص:96

41-فرخندہ رضوی، سنوخموشی کی داستان، ص:31

42-لان جائنس، ارسطو سے ایلیٹ تک، مشمولہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 1997، ص: 118

43-سلطانہ مہر، فاصلے ستا رہے ہیں، ص:7

44-فرخند؟ رضوی، فاصلے ستا رہے ہیں، ص:23

45-جمیل جالبی، ڈاکٹر، ارسطو سے ایلیٹ تک، ص:152

46-فرخند ؟ رضوی، فاصلے ستارے ہیں، ص:84

47-ایضا، ص:12

48-ایضا، ص:81

49-عبادت بریلوی، ڈاکٹر، اردو تنقید و حقیقت نگاری، از رضیہ غفور، بک پیپر ہاؤس لاہور، 2012ء ، ص96

50-فرخندہ رضوی، فاصلے ستارے ہیں، ص:33 تا34

51-ایضا، ص:111 تا112

52-ایضا، ص:119

53-فرخندہ رضوی، فاصلے ستارے ہیں، ص:5

54-مظہر سیفی، ریاض مدحت، از ریاض حسین زیدی، ساہیوال، 2000، ص35

55-فرخندہ رضوی، فاصلے ستارے ہیں، ص:84

56-فرخندہ رضوی، خوشبوئے خندہ، ص:143

57-فرخند ؟ رضوی، سنو خموشی کی داستان، ص:81

58-ایضا، ص:115

59-فرخندہ رضوی، خوشبوئے خندہ، ص:47

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

فرخندہ رضوی کی شاعری میں سماجی پہلو

ادب سے مراد وہ تحریر ہے جس سے لطف و انباط اور اور حظ حاصل ہو۔ کسی بھی زبان کے ادب کو نثر اور شاعری میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ شاعری میں ایک خاص وزن اور آہنگ ہوتا ہے۔ اسے کلام موزوں بھی کہتے ہیں جب کہ نثر میں اس طرح کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ نثر سادہ، سلیس، عام فہم، محاورہ اور بول چال کی زبان میں بھی لکھی جاتی ہے۔ اور نگین مقفیٰ و مسجع بھی ہوتی ہے۔ لیکن شاعری کے لیے شاعر کا موزوں طبع ہونا ضروری ہے جب کہ نثر نگار اس بندش و قیود سے بالکل بری ہوتا ہے۔ شاعری قدرت کا حسین عطیہ ہے جو ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔ یہ تحفہ الٰہی کسی مقدر کے سکندر کو ملتا ہے۔ اردو ادب میں رائج شعری اصناف میں قصیدہ، غزل، مثنوی، مرثیہ، رباعی، قطعہ اور نظم وغیرہ شامل ہیں۔ بقول مولانا الطاف حسین حالی:

> "یہ بات تسلیم کی گئی ہے ہے کہ شاعری اکتساب سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ جس میں شاعری کا مادہ ہوتا ہے وہی شاعر بنتا ہے۔ شاعری کی سب سے پہلی علامت موزونی طبع سمجھی جاتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو اشعار بعض فاضلوں سے موزوں نہیں پڑھے جاتے ان پڑھ اور صغیر سن بلا تکلف موزوں پڑھ لیتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ شاعری کوئی اکتسابی چیز نہیں بلکہ بعض طبیعتوں میں اس کی استعداد خداداد ہوتی ہے"(1)

غزل کو اردو کی سب سے مقبول صنف کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ آج یہ بات اہم نہیں ہے کہ غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنا یا عورتوں کی باتیں کرنا ہے۔ بلکہ اہم بات یہ ہے کہ اس کی شکل اور بناوٹ کو سمجھا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ غزل میں کیا بات کس ڈھنگ سے کہی جاتی ہے۔ غزل میں کم از کم پانچ اشعار ہوتے ہیں، زیادہ سے زیادہ کی کوئی پابندی نہیں، مگر غزل کا معیار اشعار

کی تعداد سے نہیں مضمون کی بلندی، رنگارنگی اور تخیل کے نئے پن سے پرکھا جاتا ہے۔

کبھی وہ زمانہ تھا کہ حسن و عشق، تصوف، اخلاقیات اور جام و شراب ہی غزل کے موضوع سمجھے اور مانے جاتے تھے۔ مگر وقت کی چکی نے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں کردی ہے کہ دنیا بھر کی باتیں اور مسائل اب غزل میں سمانے لگے ہیں۔ ہر رنگ اور مزاج کے شعر آج غزل کی زینت بن گئے ہیں اور یہی غزل کی مقبولیت اور پسندیدگی کا ثبوت ہے۔

شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی فکر اور تخیل کی پرواز کو اتنی گہرائی اور وسعت عطا کرے تاکہ جو فن پارہ تخلیق کرے وہ آسمان کی بلندیوں کو چھولے۔ یہ بات روز اول کی طرح روشن ہے کہ کسی بھی فن پارے کا آغاز فکر، سوچ اور خیال سے مزین ہوتا ہے۔ بقول مولانا حالی:

> "بے شمار اسباب اور مواقع جن کا انکار نہیں ہوسکتا، چاروں طرف سے ہم کو گھیرے ہوئے ہیں، جب تک عشق انسان کے دل پر حکمران ہے ہر فرد بشر کی روداد زندگی کو ایک دلچسپ قصہ بنا سکتا ہے جب تک قوموں میں حب وطن کا جوش موجود ہے۔ جب تک بنی نوع انسان ہمدردی پر متفق ہوکر شامل ہونے کے لئے حاضر ہیں اور جب تک حوادث اور وقائع جو زندگی میں وقتاً فوقتاً ہوتے ہیں خوشی یا غم۔۔۔ تب تک اس بات کا خوف نہیں ہوسکتا کہ تخیل کی طاقت کم ہوجائے گی" (2)

فرخندہ رضوی کی آواز جدید اردو غزل کی تاریخ میں نئی اور منفرد ہے۔ اگرچہ ان کی شاعری آسمان سے نہیں اتری بلکہ انہوں نے زمینی شاعروں کی مدد سے اپنی شاعری تخلیق کی ہے۔ ان کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں میں خود کو منوایا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دوسروں کے برعکس فرخندہ رضوی نے شروع ہی سے اپنے سامنے کی گوشت پوست والی دنیا اور اس کے نشیب و فراز سے آنکھ ملائے رکھی۔ اپنے سیاسی و سماجی اور تہذیبی تجربوں کو تخلیقی تجربے کی بھٹی سے گزارا اور گردوپیش کی شاعرانہ فضا اور ناقدانہ رویوں پر بھی نظر جمائے رکھی۔ نتیجتاً ان کی شاعری میں روز بروز نکھار آتا گیا اور وہ شعروں کو

صفحہ قرطاس پر بکھیرتی چلی گئیں۔

زیرِ نظر شعری مجموعے "خوشبوئے خندہ" اور "زیرِ لب خندہ" فرخندہ رضوی کی آزاد شاعری اور غزل کے پیرائے میں سجے منفرد کلام کے وہ مجموعے ہیں۔ جن میں ان کی شاعری طرزِ احساس، نئے پن اور انداز آہنگ کی جدت کے باوصف رنگ و آہنگ سے سجی سنوری نظر آتی ہے۔ چراغ سے چراغ روشن کرتے اور قدیم کی کوکھ سے نئی بات کو جنم دینے کا سلیقہ ان کے کلام میں واضح نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعرانہ نہج کی انفرادیت کو کسی شاعر یا نام سے موسوم کرنا چاہیں تو باقاعدہ کوئی نام سامنے نہیں آتا۔ وہ اپنی شاعری کے لئے اپنے لفظوں کو تخلیق کرتی ہیں نہ کہ کسی کے الفاظ چرا کر اپنی شاعری کی زینت بناتی ہیں۔ ان کی شاعری دردِ ہجراں، غمِ دوراں اور فکرِ انسان ہے۔ وہ مذہبی جنون اور دہشت گردوں پر ماتم کناں ہیں۔ وہ حقوقِ نسواں کی ترجمان ہیں۔ وہ حکمرانوں کی بے حسی اور عوام کی بے بسی کی عکاس ہیں۔ بقول جون ایلیا:

بے حسی شرط ہے جینے کے لئے
اور ہمیں احساس کی بیماری ہے

فرخندہ رضوی کی غزلیات میں گہرائی و گیرائی ہیں اور روایت و جدت کا اتصال ہے۔ زبان روائتی اور افکار باغیانہ و جدید ہیں۔ ایک غزل کے دو اشعار ملاحظہ ہوں پہلا رومانوی اور دوسرا انقلابی ہے:

ہر اک بوند ہمیں آبشار لگتی ہے
ہماری تشنگی بے اختیار لگتی ہے
قطار بجھنے کو ہیں شب زدہ چراغوں کی
نوید صبح بڑی خوشگوار لگتی ہے

(3)

فرخندہ رضوی کو شعر و ادب سے گہرا اور فطری شغف ہے۔ وہ اپنی تمام تر مصروفیات اور غم ہائے روزگار کے تقاضوں کے باوجود تخلیقی سرگرمیوں کے لیے وقت نکال لیتی ہیں۔ جس سے ان

کے بلند حوصلے، لگن اور ذوق وشوق کا اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے۔

فرخندہ رضوی بہت ملنسار اور ایک بہت نفیس خاتون ہیں۔ان کا انداز تخاطب دل موہ لینے والا ہے۔ وہ اپنے مخاطب کو نہایت عزت واحترام سے مخاطب کرتی ہیں اور ان کی یہ عاجزی و انکساری ان کے بڑے پن کا ثبوت ہے۔فرخندہ رضوی ایک اچھی تخلیق کار ہیں، ان کی شاعری جاندار ہے۔شاعری میں احساسات وواقعات کو الفاظ کے سانچے فراہم کرنے کی صلاحیت کا شعور و ادراک رکھتی ہیں۔بقول سید معراجِ جامی:

> "دراصل قلم کار وہی ہوتا ہے جو عامتہ الناس سے شعور وادراک اور فہم وفراست میں ذرا بلند ہو۔اس کی تیسری آنکھ بھی دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہو اور اس کا شعور واقعات وحالات وسانحات کو۔۔۔۔منتقل کرنا جانتا ہو۔۔فرخندہ رضوی بھی ایک کالم کار ہے اور یہ اکتسابی نہیں وہبی قلم کار ہے اس لئے اس میں شعور و ادراک کی فراوانی ہے وہ جس کو محسوس کرنا چاہتی ہے پوری شدت سے کرتی ہیں"(4)

فرخندہ رضوی حساس شاعرہ ہیں۔ وہ اپنے حساس طبع کی بدولت معاشرتی ناہمواریوں کو باریک بینی سے دیکھتی ہیں اور سماجی مسائل اور مصائب اور حقیقت کو بے نقاب کرتی ہیں۔ان کی شاعری کے موضوعات میں سماجی حالات، اپنوں کے بدلتے تیور، خودغرضی، منافق لوگ، اقتدار کی ہوس، بھوک وافلاس، حاکموں کے ظلم وستم، الفت ومحبت، وطن دوستی، دنیا کی بے ثباتی، مرد کی بے وفائی، تنہائی کا کرب، عہد حاضر کے سماجی ناانصافی و ناہمواری کے حالات کلام سخن میں نظر آتے ہیں۔خصوصاً اپنی ماں سے محبت وعقیدت کا رنگ تمام رنگوں پر اپنی گرفت کو مضبوط کرتا نظر آتا ہے۔ پہلے دو شعری مجموعے "سنو خاموشی کی داستان" اور "فاصلے ستا رہے ہیں" میں حمد ونعت کی کمی رہی مگر گزرتے وقت نے ان کی شاعری میں وسعت پیدا کی اور اسے سنوار نکھارا، تجربات کی بھٹی سے گزر کر اپنے ان دونوں شعری مجموعہ "خوشبوئے خندہ" اور "زیرلب خندہ" میں اللہ تعالی کی حمد و

ثنا اور نبی پاک سے محبت کے والہانہ ظہار کو شامل کلام کیا۔ اللہ تبارک تعالیٰ سے خواہشات کے اظہار کا ذریعہ دعا ہوتی ہے۔ انسان کی ذات ہر حال میں مکمل ہونے کی خواہش مند ہوتی ہے۔ انسان اپنے رب سے عاجزی وانکساری سے اپنی ذات کی تکمیل اور کمیوں کو پورا کرنے کی سعی وجستجو کرتا ہے۔ دوسری طرف تخیل اور سوچ کی بھی یہی حالت ہے کہ فن کی کوئی منزل نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک مسلسل سفر ہے جو فنکار کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ کیفیت فرخندہ رضوی میں بھی نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں تخیل اور فکر کی جولانیاں شعروں میں جابجا اپنی جھلک دکھاتی ہے۔

مسلمان معاشرے میں دعا اور خدا کا رشتہ ہر مسلمان کے لیے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ عبادت میں دعا کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ بغیر دعا عبادت کا صلہ نہیں ملتا ہے۔ شاعری چونکہ انسانی احساسات وجذبات کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے شاعری میں دعائیہ عنصر لازمی پایا جاتا ہے۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ ہر انسان بالخصوص مسلمان اللہ تعالی پر توکل کرتے ہوئے اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے دعائیں اور مناجات کرتا ہے۔ تکمیل کا یہ سلسلہ ساری زندگی جاری و ساری رہتا ہے۔ صوفیا اکرام کے نزدیک یہ ایک ایسا سفر حیات ہے جس کی کوئی اخیر نہیں ہوتی ہے۔ حضرت علی کا فرمان ہے کہ اگر میری زندگی میں دکھ نہ ہوتے تو میں اپنے رب کے ساتھ دعا کا رشتہ کیسے نبھاتا۔ فرخندہ رضوی کا خوبصورت دعائیہ انداز ملاحظہ ہو:

التجا ہے میری بس یہ رب سے
حمد منسوب ہو میرے رب سے
رحم ہو مجھ پہ بھی میرے مولا
مجھ کو نسبت ہے شاہ عرب سے

(5)

فرخندہ رضوی اپنے رب پر یقین کی بدولت اس چیز کو بخوبی جانتی ہیں کہ انسان کو جس چیز کی لگن اور طلب ہو اسے حاصل کرنے کے لیے بھرپور سعی وکوشش کرتا ہے اور بالآخر اسے ضرور پالیتا ہے۔ دراصل یہ اس کے یقین کی چیز ہوتی ہے۔ اللہ تعالی قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں:

"ترجمہ: انسان کے لیے وہی ہے جس کے لیے اس نے کوشش کی"(6)

فرخندہ رضوی کے بھی دل میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور اطاعت خدا کی رضا کے لئے اس بات کو فرخندہ رضوی اپنی شعری پہناوے میں یوں پیش کرتی ہیں:

میں جھکاتی رہوں سر اپنا تیری چوکھٹ پہ
میرے ہر لمحہ کو تو دیدہ تر سا کر دے
سجدے ہوں بس تیرے شکرانے کے ہوں
ذہن و دل کو میرے تو اور وسیع تر کر دے

(7)

محبت وہ سماجی جذبہ ہے جس کے بغیر کائنات کے سارے رنگ پھیکے ہیں۔ محبت خوشبو ہے محبت زندگی ہے محبت وہ ساز ہے جو دو دلوں کے درمیان بجتا ہے اور انہیں ایک کر دیتا ہے۔ محبت ایسی مہک ہے۔ جس کی بھینی بھینی خوشبو عاشق اور معشوق کو اپنے اطراف میں گھیرے رکھتی ہے۔ محبت کے دم سے دنیا کا نظام چل رہا ہے۔ کائنات محبت کے رنگوں کی مرہون منت ہے۔ فرخندہ رضوی کی غزلوں میں بھی محبت کا بھرپور رنگ نمایاں ہے۔ محبوب سے محبت کا خوبصورت اور جوشیلا اظہار اندازہ ملاحظہ ہو:

ستارے، فلک، یار تیرے لیے
محبت کا سنسار تیرے لیے
سجاتی ہوں ہر رات جان جاناں
میں خوابوں کا بازار تیرے لیے

(8)

فرخندہ رضوی کی نظموں اور غزلوں میں جابجا محبت بھری داستانیں رقم ہوتی نظر آتی ہے یہ محبت کا رنگ بعض جگہ پر انفرادی طور پر نظر آتا ہے۔ ماں کے حوالے سے بہت حساس دل واقع ہوئی

ہیں۔ اپنی ماں سے محبت اور عقیدت کا رنگ اس قدر گہرا ہے کہ باقی سارے رنگ پھیکے پڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی بہت ساری شاعری اپنی ماں کے لیے وقف ہے۔ فرخندہ ماں سے محبت کے نذرانوں کو شعروں کے گلدستوں سے سجا کر یوں پیش کرتی نظر آتی ہیں:

ماں میں عظمت، ماں میں محبت، شفقت ہے
ماں کے ہی پاؤں کے نیچے جنت ہے

(9)

محبت جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو عشق کا روپ دھار لیتی ہے۔ عشق گہری محبت اور چاہت کا نام ہے۔ عشق ایسا بے لگام گھوڑا ہے۔ جس کو روکنے کی کوئی سبیل نہیں ہوتی۔ فرخندہ رضوی کے عشق کا نمونہ ملاحظہ ہو:

عشق والوں نے دے دیئے فتوے
دل نے اک تصویر جو بنائی ہے

(10)

عشق کی دو اقسام ہیں؛ عشق مجازی اور عشق حقیقی، عشق انسان سے ہو تو عشق مجازی کے زمرے میں آتا ہے۔ اور عشق خدا سے ہو جائے تو وہ عشق حقیقی کہلائے گا۔ انسان سے عشق عاشق بنا دیتا ہے اور رب سے عشق ولی بنا دیتا ہے۔ یہ فرق ہے دونوں محبتوں میں۔ محبت اور عشق آج کی کہانی نہیں ہے۔ جب سے دنیا بنی ہے محبت اور عشق کی داستانیں ہر سو بکھری نظر آتی ہیں ہے۔ محبت انسانی فطرت میں اس طرح رچی بسی ہوئی ہے کہ اگر انسان کے جسم سے محبت نکال لی جائے تو باقی صرف ہڈیوں اور گوشت سے بنا ایک ڈھانچہ بچتا ہے۔ یہ محبت کی مٹھاس اور چاشنی کی برکت ہے۔ جس نے انسان کو اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کیا ہے۔ شبلی نعمانی عشق و محبت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"عشق و محبت کے جذبہ فطرت انسان کا خمیر ہے اس لئے تمام
دنیا کی شاعری میں عشقیہ شاعری عام ہے۔ لیکن ایران اس
خصوصیت میں تمام دنیا سے بڑھا ہوا ہے۔ ایران کا تمدن کئی

ہزار برس کا ہے۔ تین ہزار برس کے مسلسل عیش و نعمت کو انتہا
تک پہنچا دیا تھا۔ آب و ہوا، سبزہ زار، آب رواں، لالہ و گل،
دماغوں اور طبیعتوں کو ہمہ وقت نشاط انگیز اور ولولہ خیز رکھتے
تھے۔۔۔ حسن و جمال کے لحاظ سے ملک یوسفستاں تھا۔ ان
سامانوں کے ساتھ ایران میں غزل گوئی کی ترقی ایک لازمی چیز
تھی"(11)

اللہ تبارک تعالی کی وحدہ لاشریک ایسی ذات اقدس ہے۔ جو اپنی صفات میں اور عبادات میں کوئی ثانی نہیں رکھتی۔ یہ ساری کائنات اسی وحدہ لاشریک کی محتاج ہے۔ اس حقیقت کا ادراک ہر ذی روح کو ہے کہ اس کی رضا اور تسلیم کے بغیر نہ کوئی چیز تخلیق ہوتی ہے اور نہ کوئی کر سکتا ہے۔ ساری قوتیں اور طاقتیں ایک طرف ہو جائیں تب بھی کوئی اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ مسلم سماج کے انسان اپنے ربِ ذوالجلال پر قوی یقین رکھتے ہیں کیونکہ کائنات کا ذرہ ذرہ خدائے وحدہ لاشریک کے ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ وہ کل جہانوں کا شہنشاہ اعظم ہے:

لکھتا ہے وہی ہر بشر کی تقدیر
واللہ علی کل شیءٍ قدیر

فرخندہ رضوی اپنے رب کی ربوبیت کا اقرار کچھ اس طرح سے کرتی ہیں

ہیں سر خندہ خمیدہ میرے رب
تو ہی سچا تو ہی ہے حق الیقین
(12)

فرخندہ رضوی چونکہ مسلم سماج کی سچی مسلمان شہری ہیں۔ اس ناطے وہ لوگوں کو بھی توحید پرستی کا درس دیتی ہے مسلم سماج کا پہلا قوی پہلو "وحدہ لاشریک کا اقرار" ہے اور دوسرا اہم پہلو جس کے بغیر دین نامکمل ہے نبی پاک سے محبت کرنا ان پر کامل یقین رکھنا، مسلم سماج کا اہم رکن مانا جاتا ہے کیونکہ دین و دنیا کی کامیابی نبی پاک کی اتباع و محبت میں ہے۔ سیرت طیبہ پر عمل پیرا ہو کر دنیا

وآخرت کی کامیابی پوشیدہ ہے۔ نبی پاک ﷺ دنیا کے لیے رحمت بن کر آئے۔ آپ کی زندگی مبارکہ آپ کا طرز حیات مکمل ضابطہ حیات ہے۔ زندگی کا کوئی ایسا پہلو یا شعبہ ایسا نہیں جس کے لئے آپ کی زندگی سے راہنمائی نہ ملتی ہو۔

اردو شاعری میں حضرت محمد ﷺ سے محبت کا اظہار مختلف طریقوں سے روز اول سے ہی ہو رہا ہے ہر شاعر کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ یہ شرف حاصل کرے۔ اصناف نظم میں با قاعدہ ایک صنف نعت اس کے لیے وقف ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ غزل گو شعرا بھی اپنی غزلوں میں حضور اکرم ﷺ کی شان اقدس میں نذرانہ عقیدت مختلف طریقوں سے پیش کرتے ہیں۔ ہر ایک شاعر کا انداز عقیدت علیحدہ علیحدہ ہے۔ حضور اکرم ﷺ پر درود وسلام بھیجنا ہر مسلمان کے لئے باعث مسرت اور فرحت انگیز احساس ہے۔ اس سے دلی سکون اور راحت حاصل ہوتی ہے۔ آج ہمارے سماج میں لوگوں کے دلوں میں نبی پاک ﷺ کی محبت اس قدر رائج ہو چکی ہے کہ ہمارے سماج کے لوگوں نے اپنی گاڑیوں کے پیچھے لگوایا ہوا ہے۔" کیا آج آپ نے درود پاک پڑھا"۔ اللہ تعالی قرآن پاک میں ارشاد فرماتے ہیں:

"ترجمہ: بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی ﷺ پر درود بھیجتے
ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود وسلام بھیجو" (13)

مسلم سماج کی شہری فرخندہ رضوی ایک توحید پرست اور ایک سچی عاشق رسول ﷺ ہیں۔ وہ اگر چہ دیار غیر میں رہ رہی ہیں لیکن وہ اپنی زندگی اللہ اور سنت رسول ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے گزار رہی ہیں۔ وہ صوم وصلوٰ ﷺ کی پابند ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی اور گھریلو ماحول کو عین اسلام کے مطابق بنا رکھا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی محبت ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان کے اشعار میں اپنے نبی ﷺ کی محبت وعقیدت کے جھلکیاں واضح نظر آتی ہیں:

کوئی نہیں ہے ان سا نبیوں کی انجمن میں
سرتاج انبیاء ہے صلِ علی محمد

بھیجو درود خندہ اب نام مصطفیٰ پر
رحمت کا سلسلہ ہیں صلِ علی محمد

(14)

سماج کا شہری ہونے کے ناطے شاعر حضرات اپنی شاعری میں سماجی پہلو "آس وامید" کا دامن ہمیشہ تھامے رکھتے ہیں مسلمان ہونے کے ناطے انہیں یقین ہے کہ "مایوسی کفر ہے"۔آس اورامید ایک ایسا چراغ ہے۔جس کی لو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسا فن ہے جو فنکار کو مزید آگے بڑھنے کی ترغیب دیتا ہے۔اور وہ اس امید کا دامن تھامے تھامے اپنی منزل پالیتا ہے۔امید ایسا شجر ہے جو کبھی خزاں رسیدہ نہیں ہوتا۔ بلکہ ہمیشہ آس وامید کے پھولوں سے بھرا اور ہرا رہتا ہے۔آس اورامید پر دنیا قائم ودائم ہے۔اللہ پاک اپنے بندوں سے فرماتا ہے کہ کبھی میری رحمت سے مایوس اورنا امید نہ ہونا۔ ہر رات کا اختتام دن پر ہوتا ہے۔ ہر اندھیرے کے بعد روشنی ہے۔ ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔ ہر امتحان کا انعام کامیابی کی صورت میں ملتا ہے۔خزاں کے بعد بہار کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

فرخندہ رضوی نے اپنی نظموں اور غزلوں میں جا بجا آس وامید کے دیئے روشن کیے ہوئے ہیں۔ وہ اس امید کے پیرائے سے گھبراتی ہیں بلکہ حوصلہ مندی اور ہمت سے آس وامید کا دامن پکڑے زیست کی راہوں میں آگے بڑھتی جاتی ہیں۔خوبصورت آس وامید کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"آسمان ہے تو ماہتاب ہے تو
کہکشاں تو ہے چاندنی ہے تو
اپنا احوال
برا ہے حال
اور لمحے وہ وصل کے لمحے
جو تیرے میرے درمیان گزرے
اب پلٹ کر کبھی نہ آئیں گے

پھر بھی ایک آس کا دیا اب بھی
بادِ صرصر میں ٹمٹماتا ہے
ایسا لگتا ہے رت یہ بدلے گی
پھر سے آباد ہوگا دل میرا
جی رہی اس گمان پہ میں "(15)

زندگی نشیب و فراز کا نام ہے اور شاعر اپنی شاعری کو اپنے اردگرد کے ماحول کے مطابق احساسات و جذبات کی عینک پہنا کر معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ زندگی کے نئے حادثات، مسائل، دکھ درد، آزمائش، اپنوں کی جدائی اور بیوفائی کے روگ اور خوف و ہراس کے سایے کے باوجود آس و امید کا دامن تھامے رہتا ہے۔ اگرچہ شاعر دوسرے لوگوں کی نسبت حساس طبیعت کے ہوتے ہیں باوجود اس کے وہ حوصلہ مند بھی ہوتے ہیں۔ فرخندہ رضوی کے ہاں آس و امید اپنی پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ جو تلخی و ترشی کو بھی شاعری میں بدلنے کے فن سے بخوبی واقف ہیں:

سخت کالی رات میں امید کا ننھا دیا
ہے فروزاں دل میں اک معصوم جگنو کی طرح
(16)

ایسی رجائیت بھری امید جو اردگرد کے ماحول سے جڑی ہو اور جس میں شاعر معاشرے کی اصلاح کا خواہشمند ہو، ایسی امید حقیقت مندانہ کہلائے گی۔ ایسی امید سورج کی مانند ہوتی ہے۔ جس کے طلوع ہوتے ہی رات کی ساری سیاہی ختم ہو جاتی ہے۔ ہر سو روشنی ہی روشنی بکھر کر سارے ماحول کو معطر کر دیتی ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

"غم سے نباہ کا زاویہ یہ بھی ہے۔۔۔ کہ غم کو حقیقت جاننے کے
باوجود زندگی کے توازن اور وقار کو برقرار رکھا جائے، مسکراہٹ
کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ زندگی کو نفرت سے نہ دیکھا
جائے بلکہ جگرداری اور پاکیزگی کی نظر سے دیکھا جائے اور غم کو

ایک لازمی جزو قرار دے کر۔۔۔تکمیل زندگی کا ذریعہ بنایا جائے"(17)

دوغلے پن اور گرگٹ کی طرح مزاج اور رویہ بدلنے والے کو منافق کہا جاتا ہے۔منافق لوگ نہ خود خوش رہتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو خوش رہنے دیتے ہیں۔منافقت کا بہروپ سماجی اور معاشرتی المیہ ہے۔معاشرے کا دوسرا آدمی منافقت کا بہروپ اوڑھے بظاہر خوش گفتار،ملنسار اور بہت ہمدردی جتانے والا دکھائی دیتا ہے۔مگر پس پردہ کینہ پروری،نفرت اور حسد کا مارا ہوتا ہے۔یہ دوست کے روپ میں دشمن ہوتا ہے۔اور دھوکہ دہی سے دوسروں کو ذلیل وخوار کرنے کے جتن کرتا رہتا ہے۔اگرچہ ذلت وعزت صرف اللہ تعالی کے ہاتھ میں ہیں ہے۔وہ جسے چاہے دھتکار دے اور جسے چاہے عزت کے اعلی مرتبوں پر فائز کر دے۔مگر منافق اللہ پاک کی رمزوں سے واقف نہیں ہوتا۔اللہ تبارک وتعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔

"وتعز من تشاء، وتذل من تشاء

ترجمہ:اور جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے"(18)

ساری دنیا اگر مل کر بھی کسی کو گرانے کی کوشش کرے اگر رب العزت عزت دینا چاہے تو کوئی گرا نہیں سکتا۔اور ساری دنیا مل کر بھی کسی کو عزت دینے میں لگی رہے مگر اللہ عزوجل نہ چاہے تو اسے کوئی عزت نہیں دے سکتا۔

فرخندہ رضوی کو بھی وقت نے سماج کے منافق لوگوں کا چہرہ آخر دکھا ہی دیا۔وہ اپنوں کے دیے ہوئے زخموں میں چور نظر آتی ہیں۔شاعری چونکہ احساسات کا اظہار ہے یا اردگرد پھیلی زندگی کا عکس،ان ہر دو صورتوں میں سچ شاعری کو معتبر بناتا ہے۔فرخندہ کی شاعری سچائی کو پیش کرتی ہیں وہ فرضی اور لفافی لفظوں کی بجائے حقیقت کی نقاب زنی کرتی ہیں۔انداز سخن ملاحظہ ہو:

چہرے اپنوں کے بھی نہ پہچانے
دل کو کیا ہو گیا خدا جانے

سایے سے آگئے جو دھوپ میں ہم
اپنے بھی ہو گئے ہیں انجانے
(19)

فرخندہ رضوی ایک جہاں دیدہ شخصیت ہے۔ اپنے وطن سے دور بدیسی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ مختلف لوگوں سے میل ملاپ رہتا ہے۔ لوگوں کو ملنے سے ان کو لوگوں کی نفسیات کی آگاہی بہت قریب رہنے سے بہت اچھے سے ہوگئی ہے۔ وہ لوگوں کو جیسا پاتے ہیں ویسا ہی سمجھتے ہیں۔ مگر اکثر لوگ جنہیں وہ دوست سمجھتے ہیں وہی پس پردہ دشمنی کا کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ وقت نے یہ چیز انہیں اچھی طرح دکھا بھی دی ہے اور سمجھا بھی دی ہے۔ اپنوں اور دوستوں کے رویوں کے ادارک ہونے پر اپنے احساسات و جذبات سے ایسے دوست احباب کے متعلق کچھ یوں اظہار کرتی ہیں:

جن سے ملتی ہوں میں اخلاص کا پیکر بن کر
بے رخی سے وہی احباب ملا کرتے ہیں
(20)

منافق لوگ اللہ کے ناپسندیدہ لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ نہ دنیا میں فلاح پاتے ہیں اور نہ ہی آخرت میں ان کا حصہ ہوتا ہے۔ ایسے لوگ دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوتے ہیں اور آخرت میں جہنم کا ایندھن بننا ان کا مقدر بن جاتا ہے اور دراصل ایسے لوگ ہی خسارے میں رہتے ہیں۔ فرخندہ رضوی کی شاعری سچے جذبات کی عکاس ہے۔ اور سچی بات ہی دل میں اترتی ہے۔ بقول احمد ساقی:

"ہر وہ شخص جس کے قول و فعل میں تضاد ہو منافق ہے منافق دو
رخ ہوتا ہے اپنے مفاد اور مطلب کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔
ہندو، مسلم، امیر و غریب، تعلیم یافتہ، اور ان پڑھ۔ غرض یہ کہ ہر
مذہب اور ہر طبقہ زندگی میں منافقین موجود ہیں" (21)

دنیا میں منافقت اس قدر ہو چکی ہے کہ بہت ہی شاز شاز شخص اس لعنت سے بچا ہوا ہے۔

لوگ بظاہر خوش دلی سے ملتے ہیں مگر اپنے اندر کینہ اور بغض کو پالتے رہتے ہیں۔ جو کہ منافقین کی پکی نشانی ہے لوگ چہروں پہ چہرے سجا کر ملتے ہیں بہروپ بدلنا ان کے لئے معمولی بات ہوتی ہے۔ فرخندہ معاشرے کے اس المیہ کے لئے کڑھتی ہیں اور دہائی دیتے ہوئے کہتی ہیں:

ایک ایک چہرے پر ہے کئی کئی چہرے
حیرتوں میں کیوں کر پھر آج خود شناسی ہے

(22)

منافق مزاج اور دورخ منہ رکھنے والوں کے لئے مزید فکریہ توجیہہ پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں اور دل کی بھڑاس یوں نکالتی ہیں:

جب زباں اپنی کھولتا ہے وہ
جھوٹ ہی جھوٹ بولتا ہے وہ
کچھ منافق مزاج ہے اس کا
شہد میں زہر گھولتا ہے وہ

(23)

یہ دنیا فانی ہے کائنات میں کسی چیز کو دوام حاصل نہیں ہے۔ دنیا کی ہر چیز فنا ہونے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ اس دنیا میں جو آیا ہے اسے واپس لوٹنا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تبارک تعالی فرماتا ہے:

" کل نفس ذائقۃ الموت

ترجمہ: ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے "(24)

ہر مسلمان کا ایمان کامل ہے کہ قیامت ایک دن ضرور آئے گی۔ اس دن سب کچھ فنا ہو جائے گا۔ کوئی ذی روح اس کائنات میں زندہ نہیں رہے گا۔ دنیا کا نظام درہم برہم ہو کر ختم ہو جائے گا۔ آسمان بے نور ہو جائے گا۔ سمندر ابل پڑیں گے پہاڑ روئی کی طرح بکھر جائیں گے۔ تیز و تند ہوائیں چلیں گی اور سورج سوا نیزے پر آجائے گا۔ ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ فرخندہ رضوی دنیا کی بے

ثباتی اور فنا ہونے پر کامل یقین رکھتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ اس دنیا میں ہر انسان کا قیام عارضی ہے۔ کسی بھی لمحے کسی کو بھی بلاوا آ سکتا ہے۔ اور ہر انسان بلا چون و چرا قضا کو لبیک کہنے پر مجبور ہے۔ یہ عارضی زندگی کسی وقت بھی اختتام پذیر ہو سکتی ہے۔ یہ دنیا اور دنیا کے ہر سماج کی اٹل حقیقت ہے جس سے انکار ممکن ہے۔ اس موضوع کو شاعری میں سمیٹنا اور سمونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مگر فرخندہ رضوی نے اس مشکل کام کو بھی آسان کر دیا ہے:

دیکھ تارِ قفس کو چیخ اٹھے
قید سے کس کی اب رہائی ہے

(25)

دنیا کی ہر شے مسلسل سفر میں ہے۔ سفر جہاں خارجی حقیقتوں کو واضح کرتا ہے اور انسانی سوچ کی بالیدگی اور وسعت عطا کرتا ہے۔ سفر کے بہت سے مقاصد ہو سکتے ہیں۔ انسان علم، سیر و تفریح، روزگار اور تجارت کے لیے سفر پر گامزن ہو سکتا ہے۔ پردیس کے معنی اپنے وطن کو چھوڑ کر کسی دوسرے وطن جا کر آباد ہو جانے کو کہتے ہیں۔ بعض اوقات فکر معاش انسان کو دیس سے پردیس جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یا اور کئی مسائل جن کی وجہ سے انسان پردیس کاٹتا ہے۔ فرخندہ رضوی بھی اپنے ملک پاکستان کو خیر باد کہہ کر طویل عرصہ سے برطانیہ کے شہر ریڈنگ میں رہائش پذیر ہیں۔ اگرچہ وہاں پرسکون اور پرآسائش زندگی گزار رہی ہیں۔ مگر اپنے وطن کی محبت اور وطن کی مٹی کی خوشبو کو کوسوں دور میں بیٹھ کر بھی یاد اور دل کو جذبہ وطن کی محبت سے شاد کرتی رہتی ہیں۔ انسان کہیں بھی چلا جائے وہ اپنے وطن کی محبت کو سینے سے لگائے رکھتا ہے اور کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ فرخندہ رضوی کو بھی مادر وطن سے جدائی بے تاب رکھتی ہے۔ بقول فرخندہ رضوی:

مجھے گلشن سے بچھڑے ہو چکی ہے عمر اک خنّدہ
لئے پھرتی ہے کب سے دشت میں بدقسمتی مجھ کو

(26)

انسانی فطرت ہے کہ جو چیز اس کی دسترس میں ہو وہ اس کی قدر نہیں کرتا اور جو چیز حاصل نہ

ہواس کے پیچھے سرگرداں رہتا ہے۔ یہی حال وطن میں رہنے والے لوگوں کا ہوتا ہے۔ وہ فکرِ معاش میں اس قدر کھو جاتے ہیں یا زندگی کے مسائل سے ایسے الجھے رہتے ہیں کہ ان کے دل میں وطن کی محبت کا جذبہ کبھی بیدار نہیں ہوتا۔ جبکہ اس کے برعکس پردیس میں رہنے والے لوگ ہر تہوار، عیدین، 14 اگست آزادی دن، عید میلا دالنبی، محرم الحرام وغیرہ جیسے خاص دنوں میں اپنے وطن کو یاد کر کے آہیں بھرتے ہیں۔ بے بسی کے ایسے موقع پر فرخندہ کا کلام سخن ملاحظہ ہو:

دیکھتے ہی دیکھتے خندہ گزر جائے گی عمر
وقت ہاتھ سے نکل جائے گا جگنو کی طرح

(27)

پاکستان کو آزاد ہوئے تقریباً 74 سال کا طویل عرصہ ہو چکا ہے ہے بہت سے حکمران آئے اور چلے گئے۔ کہیں حکومتیں بنیں اور کئی بگڑیں۔ پاکستان میں جمہوریت کے ساتھ ساتھ آمریت کے بھی تجربے ہوئے۔ جس کسی نے بھی نئی بات، نئے نعرے پر حکومت بنائی، اپنی من مانی کی اور چلتے بنے۔ پاکستان کی حالت زار کا اگر بغور جائزہ لے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ہر حکومت نے جہاں تک ممکن ہوسکا اس ملک کو لوٹا اور اپنی تجوریاں بھریں۔ سیاست دان طبقہ امیر سے امیر تر ہوتا گیا اور غریب سے غریب تر ہوتا گیا۔ ہر آنے والی حکومت نے ملک کو قرضوں کے بوجھ تلے دبانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ عوام کی خیر خواہی اور بھلائی کے نعرے کے ساتھ عوام کو نہ صرف بے وقوف بنایا بلکہ لوٹا بھی۔ سیاست کا دوسرا نام غنڈہ گردی اور لوٹ مار ہے۔ سیاستدانوں کا کام پارٹی میں شامل ہو کر ملک کو لوٹ کر دوسری پارٹی میں شمولیت اختیار کر لینا ہے۔ ایسے لوگ ملک کے غدار ہوتے ہیں بظاہر وہ ملک کی بھلائی کا ناٹک کرتے ہیں اور درحقیقت وہ ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہوتے ہیں۔ بقول فرخندہ رضوی:

بغض و نفرت کے ہدف یہ سیاست کے قتیل
بھوکے ننگے یہ بھٹکے ہوئے در در چہرے

(28)

فرخندہ رضوی اپنی شاعری میں دور حاضر کے انسانوں کا نوحہ بھی بیان کرتی ہیں۔ اور اپنے وطن کی حالت زار اور المیوں پر اپنا خون بھی جلاتی ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب جب کسی ملک میں بے انصافی، ظلم و جبر اور عوام الناس کے حقوق کو پامال کیا گیا ہے تو "انقلاب" آتا ہے۔ ہر عہد کے شعرا اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنی شاعری کے ذریعے اس ظلم و ستم کی داستاں کو رقم کرتے ہیں۔ فرخندہ رضوی ملکی صورتحال پر گہری نظر رکھی ہیں اور ہر خبر سے باخبر ہو کر وقتاً فوقتاً اپنی شاعری میں ان کا برملا اظہار کرتی رہتی ہیں:

صلہ وفاؤں کا کیسا ملا زمانے کو
اٹھے ہیں گھر سے ہی شعلے اسے جلانے کو
اجاڑتے ہو بتاؤ کیوں آشیانے کو
ذرا سا وقت ہے خندہ بہار آنے کو

(29)

جہد مسلسل کامیابی کی ضمانت ہے۔ اگر انسان کسی چیز کے حصول کے لیے کمر بستہ ہو جائے اور اس کو حاصل کرنے کی لگاتار کوشش و محنت کرتا رہے تو بالآخر اسے حاصل کر ہی لیتا ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا کام یا چیز نہیں ہے جس کو حاصل نہ کیا جا سکے۔ کوئی ایسا مشن نہیں جس کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچایا جا سکے۔ کوئی ایسی منزل نہیں ہے جس تک رسائی نہ ہو سکے۔ تمام منزلوں، مقصدوں اور اہداف تک پہنچنے کا واحد حل جہد مسلسل ہے۔ اللہ تبارک وتعالی کی یہ صفت بڑی ہی پیاری ہے کہ وہ کسی کی بھی محنت ضائع نہیں کرتا۔ جو شخص خلوص نیت سے کسی کام کے لئے تگ و دو کرتا ہے۔ اس میں وہ ضرور کامیاب ہو جاتا ہے۔ برے سے برے حالات کو محنت اور جہد مسلسل سے اچھے حالات میں بدلنے کا عزم و حوصلہ رکھتا ہے۔ فرخندہ رضوی اپنی تقریبا 64 سالہ زندگی میں زیست کے بہت سے نشیب و فراز دیکھ چکی ہیں۔ ہر مسئلہ کو ہمت اور جہد مسلسل سے حل کرنے کا فن اور حوصلہ رکھتی ہیں۔ یہ ہمت اور جہد مسلسل کا درس اور سبق ان کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے:

نہ گھبرا جذبہ کامل ہمارے
قدم چومے گی خود منزل ہمارے
یہ مانا ہے ہمارا جسم زخمی
نہیں ہے حوصلے گھائل ہمارے

(30)

جب انسان محنت کا عادی ہو جاتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ زندگی کے مسائل سے لڑنا سیکھ گیا ہے۔ پھر ایسا ہوتا ہے کہ مشکلات و مصائب خود بخود آسانیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ جہد مسلسل ایسا ہتھیار ہے جو ناممکنات کو ممکنات میں تبدیل کر دیتا ہے۔ خواہ اسے اس کام کے لیے خون جگر سے آبیاری کرنی پڑے۔ وہ حوصلہ و ہمت سے آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اس بات کو فرخندہ رضوی نے کتنے جان دار انداز میں بیان کیا ہے:

میں شاخ شاخ اگاؤں گی لہو سے اپنے برگ و گُل
میں خشک سے درخت کو شباب دوں گی ایک دن

(31)

اردو شاعری میں جہاں محبت کی گرمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں ایک بہت ضروری عنصر بے وفائی ہے۔ عاشق محبوب سے بے انتہا عشق کرتا ہے مگر محبوب عاشق کی محبت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کی محبت کو ٹھکرا دیتا ہے۔ وہ لوگ جنہیں محبت حاصل ہو جاتی ہے وہ تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ مگر سب کا نصیب ایک جیسا نہیں ہوتا۔ لیکن کچھ دل گرفتہ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو اس شکست کو بھی فتوحات سے زیادہ عزیز گردانتے ہوتے ہیں۔

فرخندہ رضوی باہمت اور مضبوط دل کی مالک ہیں۔ وہ محبت میں ہونے والی شکست کو اپنے لئے اعزاز مان رہی ہیں۔ ان کے نزدیک محبوب کی بے وفائی سے زیادہ اپنی محبت اور چاہت پر یقین ہے۔ وہ ہر لمحہ پر امید ہیں کہ ایک دن ان کا محبوب لوٹ آئے گا۔ وہ عہد وفا مسلسل نبھا رہی ہیں۔ مگر محبوب کی بے وفائی کا چرکہ جو دل کو لگا ہے اس کی اذیت سے بے اختیار پکار اٹھتی ہیں:

بیوفاؤں میں ڈھلتے دیکھا ہے
میں نے تجھ کو بدلتے دیکھا ہے
غمزدہ ہوں کہ میری آنکھوں نے
باغ امید جلتے دیکھا ہے

(32)

فرخندہ رضوی کا محبوب اس درد کو جوان کو اس کی بیوفائی، جدائی، بے رخی اور کج روی کی وجہ سے مل رہا ہے۔ اس درد کی کیفیت اور گہرائی سے تو انجان ہے۔ درحقیقت وہ اس درد کو جان ہی نہیں پایا ہے۔ اسے اس بات کا اندازہ ہی نہیں کہ اس کے بے مروت رویے اور بیوفائی نے کیسے تن میں آگ کا جوالا بھر دیا ہے۔ دل کی بات دوسروں کے دل پر اسی وقت اثر کرتی ہے۔ جب اس میں صداقت وسچائی ہو۔ فرخندہ رضوی نے شاعری نہیں کی بلکہ فکری صداقتوں کے ایسے چراغ روشن کیے ہیں۔ جس کی روشنی سے معاشرتی تاریکیوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے اردگرد کے ماحول میں ایسی ہزاروں داستانیں بکھری پڑی ہیں۔ جن میں مرد محبت کرتا ہے مگر عزت نہیں دیتا۔ وہ عورت کو محض دل بہلانے کا ایک کھلونا سمجھتا ہے۔ جس طرح بچے کو بہلا پھسلا کر رام کر لیا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح محبت کا جھوٹا لارا لگا کر عورت کی زندگی خراب کر کے نظریں بدل لیتا ہے۔ اور عورت کے معصومیت کی انتہا دیکھئے کہ وہ محبت کے نام پر اپنا سب کچھ لٹا دیتی ہے۔ لیکن جب تک اس کو سمجھ آتی ہے سب کچھ ختم ہو گیا ہوتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو واقعی عورت کے پاس فقط عزت ہی تو ہوتی ہے۔ جس سے وہ عورت کہلاتی ہے۔ عزت کے بغیر عورت صرف گوشت پوست کا انسان رہ جاتی ہے۔ فرخندہ رضوی معاشرے کے اس المیے کو یوں بیان کرتی ہیں:

محبت کی فطرت میں ہے بے وفائی
محبت سے ہے لاتعلق خدائی

محبت کی تقدیر میں ہے جدائی
محبت کا انجام ہے جگ ہنسائی

(33)

شاعری میں جہاں عشق ومحبت غزل کی جان مانے جاتے ہیں۔ وہاں وصل وہجر کے بغیر ہی غزل مکمل نہیں ہوتی۔ جہاں عشق ہے وہاں وصل ہجر بھی ہوتا ہے۔ یعنی عشق میں ملنا اور بچھڑنا ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جس نے اپنی شاعری میں حسن وعشق اور وصل وہجر کے مضامین نہ باندھے ہوں۔ عشق ومحبت کے بعد ہجر ووصال غزل کا اہم ترین اور روایتی موضوع ہے۔ جس پر شعراء نے بہت سے اشعار کہے ہیں۔ شعرائے محبوب کے ہجر اور اس کے وصال کے لمحات کو بڑے سلیقے سے اپنی شاعری کے ذریعے بیان کیا ہے۔ محبوب کی جدائی کے کربناک لمحات، تمام تکلیفات وبے چینی کو موضوعِ سخن بنایا۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

"غزل اردو شاعری کی اہم ترین صنف اظہار ہے۔ اس کا ماخذ عربی قصیدے کا ابتدائی "نسب" ہے. جس میں شاعر موضوع سے ہٹ کر محبت کی داستان اور ہجر ووصال کا قصہ چھیڑ کر اپنی محبوبہ کو یاد کرتا ہے"(34)

فرخندہ رضوی کی شاعری میں محبت وعشق اور ہجر وصال کی بازگشت ان کی نظموں اور غزلوں میں گونجتی سنائی دیتی ہے۔ وہ غزل کو ہجر ووصال کے اظہار کا ذریعہ بناتی ہیں۔ محبوب سے جدائی کا غم ہجر کہلاتا ہے۔ ہجر کے لمحات کاٹنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ہجر کی کیفیات کو فرخندہ نے شعروں کے نگینوں میں سجا کر بیان کیا ہے۔ ان لمحات میں عاشق نہ جیتا ہے اور نہ مرتا ہے۔ فرخندہ رضوی اس کا نقشہ کچھ یوں کھینچتی ہیں:

"اندھیری رات ہے
اوڑھے سکوت کی چادر
نکل چکا ہے اندھیرے کا زشت رو عفریت

درخشاں چاندنی۔۔۔۔
شریک غم ہیں
غمِ ہجر کے یہ سناٹے
دلاسہ دیتی ہے مجھ کو
سلگتی تنہائی۔۔۔۔
یہ رات، غم ہجر کی رات
سحر میں وصل کی تبدیل ہو بھی سکتی ہے
جو جا چکا ہے
پلٹ کر وہ آ بھی سکتا ہے
مگر یہ جھوٹے دلاسے۔۔۔۔
ہے یہ ایسی شب ہجر جس کی
قسمت میں کوئی سحر ہی نہیں"(35)

یہ انسانی فطرت ہے کہ جب وہ بہت زیادہ پریشان ہوتا ہے اسے لامتناہی رنج والم کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو دوسروں سے اپنے غموں کو چھپانے کے لیے خوامخواہ ہی بات بات پر ہنستا اور قہقہے لگاتا ہے تاکہ دوسرے اس کے دکھ درد کو محسوس نہ کر سکیں۔لیکن سمجھنے والے سمجھ ہی جاتے ہیں کہ یہ بلا وجہ کا مسکرانا اور ہنسنا فریب سازی ہے حقیقت نہیں۔وہ اس ہنستے مسکراتے چہرے کے پیچھے والے اداس چہرے کی اداسی پہچان لیتی ہیں۔تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتی ہیں:

تم اتنا جو مسکرا رہے ہو
کیا غم ہے جس کو چھپا رہے ہو

فرخندہ رضوی گزرے ہوئے دنوں کو یاد کرتی ہیں اور محبوب کے پاس ہوتے ہوئے خود کو دنیا کا خوش نصیب مانتی ہیں۔اپنی شاعری کو ایسے حسین جذبات سے معمور مزین کر کے یوں پیش کرتی ہیں:

دامن تھا تیرے عشق کا جب ہاتھ میں میرے
اس کار جہاں میں مجھے گھاٹا ہی کہاں تھا

(36)

دور قدیم میں عورت کو کسی قسم کے حقوق حاصل نہ تھے مگر گزرتے وقت نے عورت کو بھی حقوق فراہم کیے ہیں خصوصاً دین اسلام میں عورت کو خواہ وہ ماں، بیٹی، بیوی کسی بھی روپ میں ہو اسے عزت وتکریم سے نواز کر سماج میں عورت کو بلند مقام حاصل ہو گیا ہے۔ آج کی عورت خواہ وہ ڈاکٹر ہو یا شاعرہ اسے سماج میں مردوں کے برابر حقوق حاصل ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب خواتین مرد بن کر شاعری کیا کرتی تھی۔ لیکن آج وقت اور سماج بدل گیا ہے ہر گزرتے وقت نے آگاہی وفہم کے دریچے کھول کر لوگوں کو احساس شعور بخشا ہے۔ خواتین نے زندگی کے ہر شعبے میں اپنے آپ کو منوالیا ہے۔ اللہ تعالی نے جنسی لحاظ سے عورت اور مرد کو الگ الگ تخلیق کیا ہے۔ سوچ و بچار اور فکر کے دھارے الگ الگ رکھے ہیں۔

فرخندہ رضوی کے یہاں عورت کے متعلق سب سے جاندار اور پر مقصد پہلو" ترقی پسندیت" کا ہے وہ عورت کو سماج ومعاشرے میں مساوات کا درجہ دلانا چاہتی ہیں۔ وہ عورت کو مرد کے ساتھ چلنے کی تلقین کرتی ہیں۔ آج کے بدلتے ہوئے سماج اور جمہوری نظام کے مطابق وہ عورت کو اس کے حقوق سے آگاہی حاصل کرانا چاہتی ہیں۔ اسی باعث ان کی نظموں میں نسوانی حقوق کی بات اور انقلابی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔" آج کی عورت" اسی نوعیت کی شاہکار نظم ہے۔ جن میں فرخندہ رضوی کا لب ولہجہ، طرز بیان اور تفکرات خیالات عورت کے تئیں حوصلہ مندانہ ہیں۔" آج کی عورت" نظم میں فرخندہ رضوی فجائیہ وندائیہ لہجہ میں کہتی ہیں۔ اے عورت وقت کی نزاکت کو پہچان اور میرے ساتھ چل یعنی زمانے کے ساتھ تجھے چلنا ہے۔ تیرے قدموں میں آنے والی ہر تہذیب وتمدن کی بہار ہے۔ یعنی جس سماج ومعاشرے کی ہم جنت نشان بنانا چاہتے ہیں تجھ ہی سے اس سماج کی ترقی کا دارومدار ہے۔

فرخندہ کہتی ہیں کہ اے عورت اگر تجھے اپنی حیثیت پہچاننا ہے، سماج میں مرتبہ حاصل کرنا ہے

ہونے والے استحصال سے بچنا ہے تو تجھے اس مجلس سے خلوت سے جست لگانی ہوگی زندگی جدوجہد کا نام ہے۔ تقدیر پر اکتفا کر کے بیٹھنا تیرے لیے ٹھیک نہیں ہے اور صرف مرد کے پہلو کو ہی تو جنت نہ سمجھ بلکہ جو آزاد روش مرد نے اختیار کی ہے، اس راہ پر بھی تجھے مسافت طے کرنی ہے۔ فرخندہ رضوی عورت کو اس کی حیثیت اور وجود کی اہمیت سے آگاہی حاصل کرواتی ہیں۔

اکیسویں صدی کا ابھرتا ہوا نسوانی قافلہ فرخندہ کے تخیل کے مطابق آج تیزی سے ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔ خلا میں پرواز کر رہا ہے یعنی آسمان سے تارے توڑ کر لانے والی کہاوت مصداق ثابت ہو رہی ہے آج کی عورت اپنی ہستی کو پہچاننے لگی ہے اور سماج کے مردوں کو چیلنج کرتی ہے کہ وہ چمن سے خزاں کو نکال سکتی ہے۔ اس کی قوتیں اب رائیگاں جانے والی نہیں ہیں۔ عورت کو مرد کمزور سمجھتے ہیں، لیکن آج اس کی لوری للکار بن چکی ہے، نغمہ جھنکار بن چکا ہے، سوئی تلوار بن چکی ہے۔ نیز عورت کی زندگی میں اب صرف غلامی اور غموں کو پینا ہی نہیں بلکہ وہ شبنم کے ساتھ چنگاری کا روپ دھار چکی ہے۔ القصہ مختصر، آج کی عورت کسی سے بھی کسی طرح کم نہیں ہے۔ اکیسویں صدی کی عورت جس راہ پر گامزن ہے۔ ہندوستانی نقشے پر ہی نہیں بلکہ عالمی سطح اور پیمانے پر تاریخ رقم کر رہی ہے۔ مجلس قانون ساز سے لے کر زندگی کے ہر شعبے میں یہ صنف نازک اپنی لیاقت، اہلیت اور وجود کے نقش ثبت کر چکی ہے۔ اور ان تمام حالات کا ردعمل میں فرخندہ کی شاعری میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اور یہ سچ ہے کہ فرخندہ کی شاعری میں تانیثیت کا تصور کی بدلتی ہوئی سماجی کی ناری کا ترجمان ہے۔ بقول پروفیسر محمود الحسن شاکر:

> "میں سمجھتا ہوں کہ نسوانی آزادی کے بعد عورت کا لہجہ نسائی ہونا چاہیے۔ جیسا کہ جدید دور میں بعض شاعرات نے اسے اپنایا ہے فرخندہ بھی جب نسائی لہجے میں بات کرتی ہیں تو ان کی شاعری پر تاثیر ہو جاتی ہے۔ میں نے اس کی جتنی شاعری پڑھی ہے۔ اس میں جہاں جہاں نسائی لہجہ اپنایا، اس شاعری کا مزاج ہی الگ ہے" (37)

فرخندہ رضوی حقوق نسواں کی ترجمان ہیں وہ عورت پر ہونے والے مظالم کو سماج کے سامنے بے نقاب کرتی ہیں۔ عورت کے حقوق کے لیے آواز بھی اٹھاتی ہیں۔

فرخندہ رضوی کو گلشن اداب کے لئے لکھتے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا ہے۔ ان کا شعری سفر جاری وساری ہے۔ جس طرح وقت کے ساتھ انسانی معاشرہ تبدیل ہو رہا ہے اسی طرح شعری فکر میں بھی متنوع تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ ہر گزرتے وقت نے مرد کو عورت کی اہمیت وافادیت بتادی ہے۔

ہمارے پیارے نبی ﷺ نے ہزاروں سال پہلے عورت کو ہر روپ جیسے بیٹی، بیوی، ماں، بہن میں جو عزت بخشی تھی اور اسے رحمت اور جنت جیسی نعمتوں کے نام سے نواز کر گویا عورت کی عزت وتکریم پر مہر ثبت کر دی تھی۔ آج عورت کو اسی زاویہ عزت سے دیکھا جاتا ہے۔ فرخندہ رضوی کی شاعری میں نسائیت کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ انہوں نے عہد حاضر میں عورت کے روشن مستقبل کو شاعری میں اجاگر کیا ہے۔ عورت اپنے تقدس کی حد بندی میں رہ کر دین ودنیا میں سرخرو ہو سکتی ہے۔ بقول فرخندہ رضوی:

بڑا تلخ گزرا ہے نسواں کا ماضی
کہ عورت کی تھی زندگی بھی سزا سی
گھروں میں خواتیں کو قیدی بنا کر
تھے خوش مرد عورت پہ پہرے بٹھا کر
بنا کر رکھا سب نے معذور اس کو
کہ شعر و ادب سے رکھا دور اس کو
حقوق اس کے اب پاسباں بن گئے ہیں
کہ آزادی کے ترجماں بن گئے ہیں
وہ ہے صدر شعبہ تو ہے شاعرہ بھی
فنون ادب کی ہے وہ ساحرہ بھی

اک عورت کا درجہ نہیں کمترانہ
چلے اب وہ مردوں کے شانہ بشانہ

(38)

فرخندہ رضوی کی شاعری غم دوراں اور فکر انسان ان کی سماجی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ زیر نظر مجموعہ "خوشبوئے خندہ" ان کی تازہ غزلیات اور منظومات اور آزاد نظموں پر مبنی ہے۔ غزلیات میں سلامت و بلاغت ہے۔ احساس کی شدت اور شعور کی جدت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔

فرخندہ رضوی صحیح معنوں میں ایک انسان دوست شاعرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ایک جانب تو انسانی معاملات سے رغبت کے پہلو نکلتے ہیں اور دوسری جانب وہ انسانی دکھ درد کی کیفیت کو شدت سے محسوس کرنے کی حس ادارک وفہم رکھتی ہیں۔ انسانی مسائل اور رنج والم کو ہنر مندی سے پیش کرنا بھی فنکاری کے زمرے میں آتا ہے اور انسانی غم کو آفاقی سطح سے ہمکنار کر دینا ہنر مند شاعر کا ہی کام ہوسکتا ہے۔ فرخندہ رضوی کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے انسانی درد و الم کی کہانیوں کو پہلے ذاتی آشوب کی بھٹی میں اچھی طرح پکایا ہے۔ پھر اس عصری آشوب کے سانچے میں ڈھال کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

نظم سانحہ پشاور میں ان کی شاعری اپنے کمال کو پہنچتی نظر آتی ہے۔ وہ آرمی پبلک اسکول میں مذہبی جنونیوں اور دہشت گردوں کے ہاتھوں شہید ہونے والے طلباء وطالبات پر ماتم کناں ہیں۔ وہ انسانیت پر ہونے والے ہر قسم کے ظلم وستم پر آواز اٹھاتی ہیں۔ وہ مسئلہ مقبوضہ کشمیر ہو یا مسئلہ فلسطین وشام، وہ عالمگیر سطح پر ہونے والے مظالم پر بھی ماتم کناں ہیں اور دعا گو ہیں کہ شر پھیلانے والے عناصر کو نیست ونابود اور صفحہ کائنات سے پاک کر دے "یارب"۔ 16 دسمبر 2014 کو پیش آنے والے سانحہ پشاور پاکستان کی قوم کے لئے یوم سیاہ ثابت ہوا۔ فرخندہ رضوی کی سو سال وطن عزیز کے اطفال کی ناگہانی شہادت کے حوالے سے کہتی ہیں:

کیسے بھلائے کوئی پشاور کا حادثہ
بچوں پہ دردناک جو گزرا ہے سانحہ

دہشت گردوں نے روز قیامت دکھا دیا
معصوموں کو ستم کا نشانہ بنا دیا
بکھری پڑی تھیں سینکڑوں لاشیں ادھر ادھر
اپنے ہی خون کے پہنے تھے بچے سبھی کفن

(39)

اتنی دردناک موت کو دیکھ کر کون سا ایسا پتھر دل ہوگا جو رویا نہ ہوگا۔ فرخندہ رضوی اس سانحے سے اتنی دل گرفتہ ہوتی ہیں کہ بے اختیار ان دہشت گردوں کے لیے خود ہی سزا تجویز کرتے ہوئے کہتی ہیں:

ان وحشیوں کے سر کو کچلنا ضروری ہے
ان قاتلوں کا دہر سے مٹنا ضروری ہے

(40)

سانحہ پشاور نے پاکستان کے کتنے گھروں کے مہکتے پھولوں کو مسل کر رکھ دیا۔ وہ پھول جنہوں نے ابھی کھل کر پھول بننا تھا اور اپنی خوشبو اور ترقی سے ملک وقوم کا روشن ستارہ بننا تھا۔ مگر ''آہ'' ان ظالم دہشت گردوں نے انہیں دنیائے گلشن میں پھلنے پھولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ سانحہ پشاور میں شہید ہونے والے بچے ملک پاکستان کی کل آبادی کے نمبر ز ضرور ہوں گے۔ مگر ان میں شہید ہونے والا ہر ایک بچہ اپنی فیملی کا روشن مستقبل اور سہارا تھا۔ ماں باپ کی آنکھوں کا تارا اور جگر کا ٹکڑا تھا۔ وہ بچے اپنے ماں باپ کے لیے صرف ایک نمبر نہیں تھے۔ آج بھی ساڑھے چھ سال گزرنے کے باوجود مائیں اپنے بچوں کی راہیں دیکھتی ہیں۔ آج بھی مائیں اپنے لخت جگر کو پل پل یاد کرتی ہیں۔

آج بھی 16 دسمبر کو شہیدوں کے گھروں میں ماتم بچھ جاتا ہے۔ آج بھی مائیں اس منحوس گھڑی کو کوستی ہیں۔ جس گھڑی انھوں نے اپنے چراغوں کو الوداع کیا تھا۔ آج بھی ماؤں نے اپنی آنکھوں سے وہ منظر نہیں بھلایا جب ان کے جگر کے ٹکڑوں کو سپرد خاک کیا گیا۔ فرخندہ رضوی ان کی شدت غم کی تکلیف کو اپنا غم سمجھ کر محسوس کرتی ہیں اور اپنے شعروں میں رنج والم کے اس المیے کو یوں بیان کرتی ہیں:

ان بچوں کی یادیں تو کبھی ہوں گی نہ معدوم
ان پھولوں سے گھر سچ ہے کہ کتنے ہوئے محروم
ہاں چہکتے طائر تھے یہ سب پھول سے بچے
ہاتھوں سے ستمگروں کے اب ہو چکے مرحوم

(41)

پاکستانی قوم کتنی بہادر اور باہمت ہے کہ اتنے بڑے دکھ کو حوصلے سے سہہ کر آج بھی اپنے نغموں اور ملی ترانوں میں دشمن کے بچوں کو پڑھانے کی بات کرتے ہیں نہ کہ ان کے بچوں سے بدلہ لینے کی:

"وہ جسے بچپن نے تھوڑا اور جینا تھا
وہ جس نے ماں تمہارا خواب چھینا تھا
مجھے ماں اس سے بدلہ لینے جانا ہے
مجھے دشمن کے بچوں کو پڑھانا ہے
وطن عزیز کی عظمتوں کو سلام
ان ماؤں کے حوصلوں کو سلام جو اپنے لخت جگر کو کھو کر بھی زندہ
ہیں اور صبر کیے ہوئے ہیں۔

سماج کی عکاس شاعرہ فرخندہ رضوی جہاں سماجی مسائل کو عمیق گہرائی سے بیان کرتی ہیں وہاں جذبات کی ترجمانی کے لیے قطعہ نگاری پر طبع آزمائی کرتی نظر آتی ہیں۔ان قطعات میں سانحہ پشاور 16 دسمبر، ماں، محبوب کی یادیں اور لوگوں کے ناروا سلوک جو ہمارے سماج کا حصہ ہیں۔ دلآویز انداز میں پیش کرتی ہیں۔ پہلا قطعہ انہوں نے ماں پر قطعہ کے عنوان سے لکھا ہے۔جس میں اپنی ماں سے والہانہ پیار کا اظہار ہے۔ ان کی ماں کا اللہ کی رحمت میں جانا فرخندہ پر غموں کا پہاڑ ٹوٹنے کے برابر ہے۔شدت غم کی اس کیفیت کو یوں بیان کرتی ہیں:

ہر ایک پل تیری یادوں سے پیار کرتی ہوں
جدائی میں دل خود تار تار کرتی ہوں
میری نگاہوں سے تم دور چھپ گئی ہو کہاں
میں اب بھی شب میں تیرا انتظار کرتی ہوں

(42)

دوسرا قطعہ انہوں نے سانحہ پشاور 16 دسمبر کے حوالے سے لکھا ہے۔ حساس دل رکھنے والی برطانوی شاعرہ کو اپنے وطن عزیز کے ذرے ذرے سے بے انتہا محبت وعقیدت ہے۔ اپنے ملکی حالات کے ناہمواریوں کو شدت سے محسوس کرتی ہیں۔ سانحہ پشاور میں ہونے والے مظالم کے لیے ماتم کناں ہیں اور اپنے وطن کے پھول جیسے بچوں کے لئے بروقت امداد کو نہ پہنچ سکیں مگر اگر اپنی شاعری کے ذریعے انہیں ہمیشہ کے لئے دوام بخشا اور ان کے لیے خصوصی طور پر شعر لکھے، جنہیں پڑھ کر قاری کے دل پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ واقعی برطانوی شاعرہ اپنے وطن کے لیے کتنا درد رکھتی ہیں:

خون روئیں گی آنکھیں تو یہ روح کانپ اٹھے گی
یاد آئے گی یہ سولہ دسمبر ہمیں جب بھی
دل ہوں گے یہ پارہ سنے گا جو یہ قصہ
اس ظلم کا سب جاننا چاہیں گے سبب بھی

(43)

تیسرا قطعہ بھی اپنی ماں کی خدمتوں سے دلی سکون اور تسکین محسوس کرتے ہوئے خود کو خود ہی دعا دے رہی ہیں کہ کہ ماں کی خدمت کا صلہ اور اجر اللہ پاک کے پاس محفوظ ہے اور وقت آنے پر فرخندہ کو وہ اجر وانعام ضرور ملے گا۔ چوتھا قطعہ ماں کی برسی پر کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ ماں کی جدائی کا صدمہ اگر پوچھنا ہو تو کسی بیٹی سے پوچھو وہ ماں کی کمی کو بتائے گی ماں اور بیٹی کا رشتہ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جدائی قدرت نہ ڈالے تو یہ رشتے کبھی جدا نہیں ہوتے:

اجر اس کا عطا کرے گا خدا
ماں کی خدمت ثواب ہے خنّدہ

(44)

پانچواں قطعہ میں فرخندہ معاشرے میں بسنے والے انسانوں کا ذکر کرتے ہوئے رشتوں کی ناپائیداری کی آہ و بکا کرتی نظر آتی ہیں۔ اپنوں کے ناروا سلوک، ہرجائی پن، زمانے کی سازش اور موسموں کی طرح لوگوں کا بدل جانا انسان کے لئے لمحہ فکریہ ہے:

تم نے ہم کو غیر سمجھا ورنہ کچھ پل کے لیے
ہم تو سمجھے تھے کہ ویرانہ ہمارا ہوگیا
جب ہوا کا رخ بدلنے کا ہنر رکھتی ہوں میں
دور میری ناؤ سے پھر کیوں کنارا ہو گیا

(45)

عصر حاضر میں سائنس اور ٹیکنالوجی نے پوری دنیا کو ایک گلوبل ولیج بنا دیا ہے۔ اب کوئی بھی باشعور انسان دنیا کے معاملات سے لاتعلق ہو کر زندگی بسر نہیں کر سکتا، اب انسان کی خوشی اور غمی کا دائرہ کار وسیع ہو گیا ہے۔ مشرق و مغرب کے فاصلے ختم ہو گئے ہیں۔ رنگ نسل اور زبان کی فوقیت کم ہوتی جا رہی ہے اور پوری دنیا میں ایک مشترکہ سوچ کی ضرورت کا احساس تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ مشترکہ سوچ و فکر کی عمارت عالمی امن، بھائی چارے اور خوشحالی کی بنیادوں پر استوار ہے۔ ایک دانش جو اور سماج فہم کی حیثیت سے فرخندہ رضوی بدلتے حالات و واقعات پر گہری نظر رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ان مسائل کی نشاندہی بھی ملتی ہے جو بین الاقوامی سطح پر درپیش ہیں۔ شاعر کی جڑیں اپنے سماج میں ہوتی ہیں شاعر اسی سماج کا عکاس ہوتا ہے۔ فرخندہ رضوی کی سماج فہمی کا نمونہ ملاحظہ ہو:

اہل زر سے بھی رابطہ رکھنا
درمیان میں مگر انا رکھنا

وقت کیسا بھی آ پڑے تم پر
زندگی سے نہ تم گلہ رکھنا

(46)

عہد جدید کا سنگین المیہ یہ ہے کہ انسان تنہا ہوتا جا رہا ہے۔ محبتوں کے قرینے بدل رہے ہیں۔ محبتوں میں کمی اور نفرتوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ بے حسی و خود غرضی نے جگہ جگہ ڈیرے ڈال کر انسانوں کو ایک دوسرے سے کوسوں دور کر دیا ہے۔ انسان کو رشتوں کی قدر نہیں رہی۔ انسان کے سوچنے کے رنگ ڈھنگ اور انداز بدل گئے ہیں۔ لوگ اپنے اپنے مفادات کی آگ میں جھلس رہے ہیں۔ اس لیے فرخندہ رضوی کہتی ہیں:

دھوپ کا نام جو ہے سایا تو سایا ہی سہی
آپ کہتے ہیں اگر ایسا تو ایسا ہی سہی
ہم بھی جینے کا محبت میں تماشا کر لیں
زندگی جو ہے تماشا تو تماشہ ہی سہی

(47)

فرخندہ رضوی کی شاعری سیاسی سماجی اور ادبی بصیرت کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے اس سماجی پہلو پر روشنی ڈال کر انہیں معاشرے کے سامنے بے نقاب کیا۔ خود غرضی اور بے چینی معاشرے کے بنیادی اجزا ہیں اور یہ بے چینیاں لوگوں نے خود پیدا کی ہیں۔ زندگی کو پر آسائش بنانے کا خواب دیکھتے ہوئے اور اپنا آرام، سکھ چین گروی رکھ کر ان آسائشوں کے حصول کے لئے لے جانے والی مصنوعی خوشیوں کے لیے دولت کماتے ہیں۔ نہ خود سکون سے رہتے ہیں اور نہ دوسروں کو چین سے رہنے دیتے ہیں۔ معاشرہ بھی انتشار کا شکار رہتا ہے۔ حالانکہ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ قدرت کی ہر چیز قابل محبت ہے ایک کامیاب معاشرہ تب تک تشکیل نہیں پا سکتا جب تک کہ معاشرے کے تمام باسی ایک دوسرے کا احترام اور خیال نہ کریں۔ اس قول کے مترادف "جیو اور جینے دو" کے اصول پر عمل پیرا ہو کر سماج میں سکون پیدا کیا جا سکتا ہے۔ فرخندہ رضوی معاشرے کی

ناہمواریوں سے صرف نو کرتے ہوئے یوں درمیانی راہ نکال کر صبر و تحمل کی فضا قائم کرنے کی کوشش کرتی نظر آتی ہیں:

راہ میں مشکلیں بھی آئیں گے
تم مگر عزم و حوصلہ رکھنا
دوست ہو کوئی یا کہ ہو دشمن
فیصلہ عدل سے جڑا رکھنا

(48)

والدین خدائے بزرگ و برتر کا عظیم تحفہ ہے۔ کیونکہ یہ وہ ہستیاں ہیں جو ہر قسم کی حرص، طمع اور غرض و مطلب سے بے نیاز ہوتی ہیں۔ اپنی ساری زندگی کا سرمایہ تو کیا وقت آنے پر اپنی جان تک قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ ماں جس ہستی کا نام ہے۔ وہ شہد سے بھی میٹھی ہے۔ محبت و اخلاص کے غلافوں میں لپٹی نور سے بھی پیاری، چاندنی کی سی ٹھنڈک لئے ہوئے بچوں پر سایہ افگن کرنے والی اور پل پل دعاؤں کے موتیوں کو نچھاور کرنے والی ہستی ماں کہلاتی ہیں۔ محبت کے جتنے نام ہیں چاہت کے جتنے رنگ ہیں۔ عشق کے جتنے جذبے ہیں ہیں سب کو گوندھ کر جو چیز بنتی ہے وہ ماں ہے۔ ماں جس کا کوئی نعم البدل ہو ہی نہیں سکتا۔ اور باپ جیسا کوئی بن نہیں سکتا۔ ایسے انمول رشتے کہ ساری دنیا کا پیار ایک طرف ہو اور ماں باپ کا پیار دوسری طرف پھر بھی ماں باپ کے پیار کا پلڑا بھاری ہوگا۔ فرخندہ رضوی ماں کی محبت کو شاعری کے انمول پیرائے میں یوں سجاتی ہیں:

ماں کی ممتا ایسا چشمہ ہے کہ جس سے سینچ کر
تپتے صحراؤں کو بھی گلشن بنا دیتی ہے ماں
دور ہو جاتی ہے خندہ سب ان کی مشکلیں
ہاتھ اٹھا کر جب بچوں کو دعا دیتی ہے ماں

(49)

ماں کے بارے میں بہت سے شعرا نے لکھا مگر ماں کی تعریف صحیح معنوں میں شاید کوئی نہ کر

پایا۔ کسی نے اسے محبت کا نام دیا کسی نے چاہت سے تعبیر کیا تو کسی نے اس کی عظمت کا اعتراف کیا۔ کہیں پر اسے ایثار قربانی کا پیکر کہا گیا۔ باوجود اس کے ماں کے رتبے تک کوئی نہ پہنچ سکا۔ آج بھی ماں کے رتبے تک کسی کی محبت کی رسائی نہیں ہوئی۔ فرخندہ رضوی نے محبت کے خمیر سے اور عطر کے نور سے ماں کی شان میں میں بے انتہا اشعار کہے۔ ماں کی محبت میں مخمور فرخندہ کہتی ہیں:

" کس خمیر سے رب نے اسے بنایا
اس کے بدن میں رحمت کا خزانہ چھپایا
پس اے خدا
یہ بارش رحمت کی آنگن میں برستے رکھنا
جس جگہ ماں نہیں
ہاں محبتیں اور رحمتیں نہیں
اے ماں تیری رحمتوں کو سلام
اے ماں تیری سب محبتوں کو سلام "(51)

فرخندہ رضوی کی اپنی ماں سے دلی وابستگی اس قدر تھی کہ جب وہ شادی کے بعد برطانیہ سیٹل ہوگئیں اور والد صاحب کی وفات کے بعد والدہ محترمہ طویل عرصہ ان کے پاس برطانیہ میں رہیں۔ جہاں فرخندہ رضوی نے اپنے ہاتھوں سے انہیں سنبھالا ان کی دیکھ بھال کی اور خوشی خوشی ان کی ذمہ داری کو احسن طریقے سے نبھایا۔ یہ اولاد کے لئے بڑی خوش قسمتی کی بات ہوتی ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کو سنبھالیں۔ ان کی دیکھ بھال کریں۔ ان کی خدمت کریں۔ اور یہ سعادت فرخندہ رضوی کو اللہ پاک نے خوب دی اور اس عادت سے انہوں نے خوب فائدہ اٹھا کر اپنی ماں کی خدمت کی۔ لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ اور وہ دنیا کو چھوڑ کر اللہ کی رحمت میں چلی گئیں۔ 9 فروری 2011 ان کی والدہ کا یوم وفات ہے۔ بقول فرخندہ رضوی:

"ماں کی موت سے بڑا کوئی سانحہ دنیا میں رونما نہیں ہوسکتا۔ یہ
حادثہ ایک ہی پل میں گھنی چھاؤں میں ٹھہرے انسان کو تپتی

ہوئی دھوپ میں کھڑا کر دیتا ہے"(52)

ماں کی وفات کے درد کو فرخندہ رضوی نے بہت شدت سے محسوس کیا۔آپ نے اس غم کو سیاہی میں ڈبو کر کاغذ پر انڈیل دیا۔وہ اپنی ماں کی جدائی کو دنیا کا سب سے بڑا خسارہ کہتی ہیں۔ماں کی جدائی کے ماتم کو اپنی ایک نظم میں دلگداز انداز میں بیان کرتی ہیں:

یک بیک رت بدل گئی کیسے
آسماں کیسے ہو گیا سیاہ
ماں تیری موت کی خبر سن کر
میری ہر سانس بن گئی آہ

(53)

باپ کا رتبہ بھی ماں کی طرح بہت بڑا ہوتا ہے۔گھر کے سربراہ کی حیثیت سے بچوں کی کفالت کا ذمہ دار ہوتا ہے باپ ایک سائبان کی طرح چھت فراہم کرتا ہے۔اس کی موجودگی میں ہر مشکل اور مسائل بیوی بچوں تک رسائی حاصل نہیں کر پاتے۔فرخندہ رضوی باپ کی تعظیم و تکریم اور ایثار و قربانی کو یوں بیان کرتے ہیں:

پرورش کرتا ہے بچوں کی وہ جی سے جان سے
لڑتا ہے ان کے لیے آندھی و طوفان سے
خود ہی جاہل پھر بھی بچوں کو پڑھا لیتا ہے باپ
ڈاکٹر، انجینئر بچے بنا دیتا ہے باپ

(54)

ماں باپ کی جدائی اولاد کے لئے اور خصوصا بیٹیوں کے لیے یہ غم بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ماں باپ وہ نعمت ہیں جو پوری دنیا کی دولت دے کر بھی حاصل نہیں کی جا سکتی ہے۔جانے والے لوٹ کر نہیں آتے ساری عمر وہ صورتیں نظر نہیں آتیں۔بقول تاجور نجیب آبادی:

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

(55)

مسلمانوں کے لئے محرم کا مہینہ بہت عزت واحترام والا ہے۔ یہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے لئے یوم سیاہ ہے۔ یہ تاریخ کا نہ بھولنے والا واقعہ ہے۔ جس میں حضرت حسینؓ جان رسول ﷺ نے اسلام کی سربلندی کی خاطر اپنی جانیں راہ حق میں قربان کیں۔ تاریخ گواہ ہے ان کی عظمت و شجاعت کی۔ انہوں نے یزید کے ہاتھ پر بیعت نہ کی۔ باطل کے آگے سر نہ جھکایا راہِ حق میں سر کو کٹوا لیا۔ سچ کا ساتھ نہ چھوڑا جان دے کر حق پر چلنا سکھایا۔ یہ شان ہے شان علی رضی اللہ عنہ کی۔ مسلم سماج اپنے نبی پاک ان کے کے نواسوں سے بے انتہا محبت بھی کرتا ہے اور اپنی جان ان کی چاہ میں قربان کرنے کا بھی حوصلہ رکھتا ہے۔ فرخندہ رضوی سچی عاشق رسول ﷺ ہیں۔ اپنی شاعری میں ماہ محرم کے نام سے میدان کربلا میں ہونے والے واقعات کو دل سوزی سے پیش کیا۔ یہ ان کی اسلام سے محبت کی دلیل ہے۔ انداز سخن ملاحظہ ہو:

رتبہ اعلی اور فضل آپ کا
آپ نے اسلام کو زندہ کیا
باطل کے آگے سر نہ جھکایا حسینؑ نے
سر ہنس کے راہ حق میں کٹایا حسینؑ نے
خندہ یہ حق کا راستہ آقا حسینؑ ہیں
اہل قلم کا واسطہ آقا حسینؑ ہیں

(56)

معلوم نہیں رنج والم میں لذتِ اول کس نے کشید کی مگر جس نے بھی کی، جب بھی کی، کمال کر گیا۔ بے حساب کر گیا کہ شاعری کا آغاز کر گیا۔ آنسو کو مسکراہٹ کرنے کا ہنر جس طرح شاعروں کو نصیب ہوا، اس اصول کو دیکھتے ہوئے یہ بات با آسانی کہی جاسکتی ہے کہ شاعری سچ مچ کانٹے کو

گلاب بنا لینے کے فن کا نام ہے۔ شاعر لوگ سماج کا اہم حصہ ہیں۔ وہ سماج میں رہتے ہوئے فرد کی زندگی کا مکمل احاطہ اور مسائل کو لوگوں کے سامنے لاتے ہوئے اداسی، آنسو، دکھ درد کا مداوا اپنے اشعار کے ذریعے کرتے ہیں اور بے بس اور لاچار دکھی لوگوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کا سبب بنتے ہیں۔ شاعر حضرات سماج کو ہنسی اور مسکراہٹ عطا کرتے ہیں۔ وہ انسان کے دکھ سکھ کے ساتھی ہوتے ہیں۔

فرخندہ رضوی بطور سماجی شاعرہ نے اپنی شاعری کو لوگوں کے مسائل و مصائب کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ روز اول سے شاعر حضرات نے معاشرے کی عکاسی کا جو بیڑا اٹھایا تھا وقت کے ساتھ ساتھ آنے والے شعرا کی بدولت کارواں تشکیل پاتا گیا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

فرخندہ رضوی کی نظموں کے جو عنوانات ترتیب دیے گئے ہیں۔ وہ مختصر اور طویل دونوں صورتوں میں ان کے منفرد اسلوب کا تعارف ہیں۔ زیر نظر شعری مجموعے " زیر لب خندہ" اور "خوشبو؟ خندہ" کے عنوانات ماں، زرد پتوں کے موسم میں، سال نو، زندگی، آج کی عورت، ماں تیری رحمتوں کو سلام، محبت جوگی ہے، ذات کا جزیرہ، سانحہ پشاور، بے حسی، لفظوں کا فلسفہ، میرا وطن، دسمبر کی یادیں، مٹی کا ڈھیر (اماں کی برسی)، خالی ہاتھ، تجدید عشق، کون آئے گا، آگے ہو تم پھر، وہ تیرے سارے خط وغیرہ خوشبوئے خندہ کا سرمایہ ہیں۔ اور نہیں محبت اب تم سے، فریب محبت، صدائے خموشی، دریچہ، سانحہ، اماں کی برسی 2011، دہشت گردی، چاند کا تحفہ، اب کے برس تیری آنکھیں، فریبی، آہ، دھند کا جنگل، غم ہجر کی رات، خوش گمانی، محبت کیا ہے آخر، فریب محبت، ماں کی ممتا، بچھڑنے سے پہلے، یادیں، میں کیسے روتی، محبت تھی یا کوئی دل لگی وغیرہ "زیر لب خندہ" کی نظموں کا سرمایہ ہیں۔ منفرد اسلوب میں لفظ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ فرخندہ کی شاعری میں معلوم سے نامعلوم اور نامعلوم سے معلوم پیکروں اور تمثالوں کے ذریعے مقامی رنگ ڈھنگ اور روزمرہ زبان میں ترسیل اظہار ملتا ہے۔

یہ لسانی گوشوارہ تمام انسان کے احساسات و جذبات کی ترجمانی ہے۔ جس نے فطری ماحول میں پرورش پائی اور دھرتی کے رنگ کو من وعن پیش کیا۔ یہ اسلوب خالص تخیلاتی و جذباتی ہے۔ جس میں فطرت اوڑھنے بچھونے کا رول ادا کرتی ہے۔ فرخندہ رضوی کے خوبصورت اسلوب کا نمونہ ملاحظہ ہو:

میری خواہش ہے میں تنویر صداقت بن جاؤں
آئینے کی طرح روشن ہوں میری تحریریں
کینوس پر میں جو لفظوں کے اتاروں خاکے
زندگانی سے ہو بھرپور میری تصویریں
(57)

شاعری صرف شاعر کے احساسات و جذبات کا اظہار نہیں بلکہ یہ ایک فن بھی ہے۔ شاعر کا کام اپنے تجربات کو شاعری کے لبادے میں پیش کرنا ہے اور یہ اس کے فن کا کمال ہوتا ہے کہ وہ زبان جو اظہار کا ذریعہ ہے اس کا خاص خیال رکھے یعنی زبان کا استعمال طریقے سلیقے سے کرے تاکہ شاعری میں جاذبیت پیدا ہو جائے۔ بقول کلیم الدین احمد:

"شاعری صرف جذبات کی ترجمانی نہیں، ایک فن، ایک صناعی بھی ہے۔ شاعر الفاظ کی مدد سے اپنے خیالات و تخیلات، ولولوں اور امنگوں سے اپنے تجربات زندگی کو ایک تعمیری عمل کی صورت میں پیش کرتا ہے اور اسے زبان میں تناسب، موزونیت اور توازن کا اس قدر خیال رکھنا ہوتا ہے جتنا بت تراش کو مجسمہ بنانے میں" (58)

جس قدر انسان کا کردار بلند ہوتا ہے اس قدر اس کا معیار بڑا ہوتا ہے۔ انسان اپنے کردار و اطوار سے ہی سماج میں اپنی قدر و منزلت قائم کرتا ہے۔ سماج میں رہنے والا انسان جتنے مرضی بڑے منصب پر فائز ہو، بہت بڑا مبلغ اور واعظ ہو، بہت زیادہ شہرت حاصل کر لے مگر کردار کے بغیر سب

کچھ بے وقعت اور بے معنی ہو جاتا ہے۔ کردار ہی وہ دولت ہے جو انسان کا معیار سماج میں قائم کرتی ہے۔ کیونکہ بلند کردار انسان بلند خیال بھی ہوتا ہے اور اس کی واضح مثال فرخندہ رضوی ہیں۔ وہ ایک بلند کردار کی مالک ہیں اور کردار کی اہمیت کو اپنی شاعری کے ذریعے یوں پیش کرتی ہیں:

گفتگو کا ایک الگ سا منفرد انداز ہے
لفظ اس کے بولتے ہیں جیسے گھنگھرو کی طرح

(59)

فرخندہ رضوی کا کہنا ہے کہ بلندی کردار آپ کی عزت و آبرو کی ضامن ہے۔ یعنی آپ جیسا کردار لوگوں کے ساتھ ادا کرو گے ویسا ہی تمہارے ساتھ ہوگا، یعنی اگر تم اپنا کردار درست کر لو تو تمہیں فکر مند ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ تمہارے لئے بھی لوگوں کا کردار اچھا ہو جائے گا اور سب سے اچھا کردار تو ہمارے نبی پاک ﷺ کا ہے۔ چنانچہ اسے اپنانے میں دونوں جہانوں کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ لیکن ہمارے سماج میں لوگوں نے اپنے کردار کو اس قدر میلا بنا دیا ہے کہ ان کے گناہ دھوئے نہیں دھلتے، اور اوپر سے ستم یہ کہ لوگ اللہ کا خوف بھول چکے ہیں۔ بقول فرخندہ رضوی:

مٹ نہیں پائے گا کردار کا دھبہ خندہ
داغ دامن تو نہیں ہے کہ جو دھویا جائے

(60)

ایک کامیاب سماج کے افراد کا لچک دار شخصیت کا حامل ہونا ضروری ہے۔ سماج کے لوگ جتنا نرم مزاج ہوں گے سماج اتنا ہی پرسکون اور کامیاب ہوگا۔ مشہور کہاوت ہے "نرمی کھا جائے جگت کو اور گرمی اپنے آپ کو" کسی بات پر بے جا اڑ جانا اور ضد و انا کا شکار ہو جانا انتہائی نقصان دہ چیز ہے۔ اگر خود سے دوسروں کی رائے بہتر ہو یا اپنے نظریے سے دوسرے کا نظریہ سود مند ہو تو دوسرے انسان کو لچک دکھانا چاہیے کیونکہ یہ بات سماج کے حق میں جاتی ہے۔ ایسا سماج پھلتا پھولتا ہے اور یہ افراد کے لچکدار رویوں کا مرہون منت ہے۔ اکثر اوقات بے جا سختی، ضد اور انا تعلق کو نگل جاتی ہے۔ انسان اپنی اکڑ اور سخت پسندی کی وجہ سے بڑے بڑے اہم لوگ دوست اور رشتہ دار دور ہو

جاتے ہیں جبکہ پیار و محبت اور نرمی کی بدولت نہ صرف اپنوں بلکہ غیروں کو بھی اپنا بنایا جا سکتا ہے۔ بقول فرخندہ رضوی:

کبھی شاخ کی طرح ٹوٹے جو تم
تمہیں تھام لیں گی دعائیں میری
(61)

شاعر حضرات چونکہ حساس طبیعت کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ آج کے عام لوگوں کی نسبت چیزوں کا اور لوگوں کا زیادہ غور سے جائزہ لیتے اور محسوس کرتے ہیں اور جیسا محسوس کرتے ہیں ویسا شعروں میں بیان کر دیتے ہیں۔ فرخندہ رضوی معاشرے کو سیاسی، سماجی اور معاشرتی طور پر گراوٹ کا شکار دیکھتی ہیں اور اس پر رنجیدہ ہو جاتی ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ معاشرہ ہر لحاظ سے خواہ معاشی ہو یا سماجی، اقتصادی ہو یا سیاسی روز بروز گراوٹ کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اپنے تجربے کی بنیاد پر اس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ جو چیزیں کبھی باعث رسوائی سمجھی جاتی تھی، جنہیں قابل تہذیب مانا جاتا تھا وہی چیزیں اب کامیابی و ترقی کی ضامن سمجھی جانے لگی ہیں۔ ایسے حالات کا نقشہ فرخندہ کچھ یوں پیش کرتی ہیں:

ایک ایک چہرے پر ہیں کئی کئی چہرے
حیرتوں میں کیوں کر پھر آج خود شناسی ہے
میری خواہشیں مجھ کو یہ کہاں پہ لے آئیں
ہے برہنگی ہر سو، ہر سو بے لباسی ہے
(62)

دنیا آزمائش کی جگہ ہے ہمارے سماج میں دھوکے کا بازار گرم ہے۔ سماج میں رہتے ہوئے ہر پل انسان کو مختلف قسم کی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ فرخندہ رضوی دنیا کو بڑی گہری نظر سے دیکھتی ہیں اور سماج کی مختلف حقیقتوں کو منظر عام پر لاتی ہیں۔ فرخندہ کا کہنا ہے کہ سماج میں عزت کا معیار دولت ہے۔ یہ سماج دولت مند اور اہل ثروت لوگوں کو معزز اور قابل احترام مانتا ہے۔ غریب اور مفلس انسان کو معتبر اور معزز نہیں سمجھتا۔ اس دنیا میں انسان کے کمتر ہونے کی واحد وجہ مفلسی و

غربت ہے۔ سماج میں اگر کوئی معزز بننا چاہتا ہے تو اس کے لئے اسے دولتمند ہونا پڑے گا۔ انسان کی وقعت اب ختم ہوگئی ہے اور اب صرف چڑھتے سورج یعنی پیسے اور دولت کو سلام ہے۔ ایسے گھٹے ہوئے ماحول میں فرخندہ کا احساس زندہ ہے۔ بقول فرخندہ رضوی:

ابھی احساس کی سرگرمیاں ہیں
ابھی پتھر نہیں ہیں دل ہمارے

(63)

جس طرح عزت کمانے کے لئے دولت مند ہونا لازم ہوگیا ہے اسی طرح رشتے داری قائم رکھنے کے لیے حالات کا اچھا اور سازگار ہونا ضروری ہے۔ اس سماج کا بدقسمتی سے یہ رواج بن گیا ہے کہ اگر کسی کو کوئی مسئلہ درپیش ہو تو لوگ ساتھ تو درکنار، پہچاننا بھی گوارا نہیں کرتے ہیں۔ مگر وہ لوگ جو اچھے حالات میں ہر وقت ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ ضرورت پوری ہوتے ہی اور غرض پوری کرتے ہی رفو چکر ہو جاتے ہیں۔ عجیب وطیرہ ہے اس سماج کا۔ بقول فرخندہ رضوی:

اب کیسے ملے جنت و دوزخ کی بشارت
اعمال کے سکے تو سبھی کھوٹے کھرے ہیں
رہتا ہی نہیں ہے کسی رشتے میں توازن
جو عقل کے نزدیک ہیں وہ دل سے پرے ہیں

(64)

غزل کو معنوی اعتبار سے ابتدا ہی سے کلام تصور کہا جاتا ہے۔ جس میں حزن وغم اور سوز و فراق کے نالے اور نوحے بیان کیے جاتے رہے ہوں کیونکہ غزل میں طربیہ رنگ اس کی چاشنی میں کمی کر دیتا ہے۔ غم واندوہ اور سوز و گداز ایسے عناصر ہیں۔ جو ہر آدمی کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ اس کے برعکس طربیہ کو بہت زیادہ شوق سے پسند نہیں کرتے کیونکہ ان کے خیال میں دنیا میں غم زیادہ ہیں اور اسی سے انسان کو اپنی وابستگی رکھنی چاہیے۔ اس بات سے انکار قطعی ممکن نہیں کہ عشق مجازی دراصل عشق حقیقی کا زینہ ہے۔ جو شخص عشق مجازی میں مبتلا نہیں ہوگا وہ عشق حقیقی کی

لذت سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا ہے۔فرق صرف لذت کا ہے۔عشق مجازی لذت مادّی وجسمانی مانگتا ہے۔جبکہ عشق حقیقی لذت روحانی کا طلبگار رہوتا ہے۔فرخندہ رضوی نے پہلے عشق مجازی کو اپنایا۔ انہوں نے محبوب کی شان میں سخن سرائی کی اور اپنے محبوب کے جلوں سے خود کو سرشار کیا۔

فرخندہ نے جو کچھ بھی لکھا وہ ذاتی طور پر محسوس کر کے لکھا۔محض خیالی گھوڑے نہیں دوڑائے۔ عشق جاناں ان کی غزلوں اور نظموں کا جاندار موضوع رہا ہے۔فرخندہ نے اپنی شاعری کو روایتی انداز میں محض فکری اعتبار سے نہیں دیکھا بلکہ ذاتی تجربات کی عکاسی کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں حقیقت اور تازگی کے عناصر ملتے ہیں:

ہم نے کب عشق کو سمجھا ہے تجارت جاناں
عشق تم سے ہے خسارہ تو خسارہ ہی سہی

(65)

گویا عشق جاناں ہی وہ موضوع ہے۔جس کے بغیر ہماری غزل ادھوری ہے۔عشق نہ ہوتا تو شاید غزل کا وجود نہ ہوتا۔عشق جاناں غزل کا جزوِ خاص ہے اور غزل ہمارے سماج کے لوگوں کی پسندیدہ صنف ہے۔کیونکہ سماج میں محبت کو اہم حیثیت حاصل ہے۔سماج کے شہری کوئی محبوب پر فدا ہے تو کوئی تصوف کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔شاعر حضرات ان جذبوں کو شعروں کے ذریعے ہوا دیتے ہیں۔کبھی تو محبوب کے لب ورخسار پر غزل کہی جاتی ہے تو کبھی خدا کی ربوبیت اور رحمانیت پر غزل لکھی جاتی ہے۔بقول فرخندہ رضوی:

عقل والوں نے دے دیئے فتوے
دل اک تصویر جو بنائی ہے

(66)

آفاقیت،فنون کی ایک معروف موضوعی اصطلاح ہے۔انسانی جذبوں اور احساسات کا ایسا معنی اور جمالیاتی اظہار جو جغرافیائی اور مقامی حدود سے نکل کر کل نوع انسانی کے تجربات کی ترجمانی کرے آفاقیت کہلاتا ہے۔فرخندہ رضوی کی شاعری بھی آفاقیت کے معیار پر پوری اترتی دکھائی

دیتی ہے۔فرخندہ رضوی جہاں اپنے ملک کی بات کرتی ہیں وہیں پوری انسانیت کے لئے بھی فکرمند دکھائی دیتی ہیں۔انداز سخن ملاحظہ ہو:

حق کے دامن سے میں لپٹی ہی رہوں
جو بھی ہونا ہو مرا انجام ہو
کب بھلا خندہ وہ آئے گی گھڑی
جب جہاں میں امن عالم عام ہو

(67)

ادب میں زندگی کی سچی تصویر جیسی وہ حقیقی زندگی میں ہے پیش کرنا حقیقت نگاری ہے۔ہمارا سماج، ہماری سوسائٹی تضادات سے بھری پڑی ہے۔جس میں ظاہر کچھ اور باطن کچھ اور ہوتا ہے۔ ہمارا معاشرہ جس میں ہم رہتے ہیں دراصل دورخی معاشرہ بن چکا ہے۔عموماً دیکھا گیا ہے کہ جب لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو بظاہر بڑے تپاک کیساتھ جان نچھاور کرتے نظر آتے ہیں مگر ہمارے سماج کا انتہائی افسوسناک پہلو کہ وہی لوگ پیٹھ پیچھے زور وشور سے برائی کر رہے ہوتے ہیں۔سیاست دان جھوٹے وعدے کر کے مطلب نکل جانے پر پہچاننے سے بھی انکار کر دیتا ہے۔ جس طرح ہر داڑھی والا انسان کامل مومن نہیں ہوتا بالکل اسی طرح ہر انسان برا بھی نہیں ہوتا۔ ہر شخص کی خلوت اور جلوت میں تضاد ہے اور یہی تضاد معاشرے کی گراوٹ کا سبب بن رہا ہے۔ فرخندہ رضوی بطور شاعرہ انسانوں کی بے حسی کو شدت سے محسوس کرتی ہیں۔دکھی انسانیت کے لے درد دل رکھتی ہیں:

خندہ ہے قتل ایک کا بھی درجنوں کا قتل
رشتے جڑے ہوئے ہیں بہت آدمی کے ساتھ

(68)

ہمارے معاشرے کی اصل تصویر درحقیقت بہت ہی قبیح ہے۔اخلاقیات اپنے پست ترین درجے پر آ چکی ہے۔حقوق العباد کا موضوع صرف کتابوں تک محدود ہو گیا ہے۔انسانیت کے

حوالے سے کہیں انصاف دکھائی نہیں دیتا۔ خودغرضی اور بے حسی عام ہوگئی ہے۔ ہر شخص اپنے متعلق ہی سوچتا ہے۔ اور بس اپنے پیٹ کی فکر ہے اور ضرورت پڑنے پر دوسروں کے پیٹ پر لات مارنے سے بھی نہیں چوکتا۔ یہ بے ضمیری اور بے حسی کی انتہا ہے۔ معاشرے میں رہنے والے ہر انسان کو سب کچھ دکھائی دیتا ہے۔ مگر وہ سب کچھ دیکھ کر کنی کترا جاتا ہے اور ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا۔ مگر شاعر معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے۔ وہ چپ نہیں رہ سکتا اور تمام حقائق کو اشعار کی شکل میں معاشرے کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ فرخندہ رضوی معاشرے کی طاقتوں کو اپنے شعروں میں کچھ اس انداز سے ڈھالتی ہیں کہ ہر شعر معاشرے کی بھرپور عکاسی کا آئینہ دار بن جاتا ہے:

دور کرنی ہے تم کو گر غربت
دل کی دولت کو مال میں رکھنا
جمع کرتے ہو خواہشیں جو تم
خرچ بھی اعتدال میں رکھنا

(69)

کسی بھی شاعر کے کلام میں زبان و بیان کی سادگی وسلاست کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ زبان جتنی سادہ اور آسان ہوگی اتنا ہی زیادہ اثر قارئین کے دلوں پر ہوگا۔ مقامی زبان میں کلام کا اثر مقامی لوگوں پر زیادہ ہوتا ہے۔ زبان و بیان کی سادگی کا استعمال کلام کو پر اثر اور دلچسپ بناتا ہے۔ فصاحت و بلاغت کی پاسداری، روزمرہ اور بامحاورہ جملوں کا برملا استعمال، کلام میں زبان اور بیان کے حوالے سے چاشنی کا سبب بنتے ہیں۔ بقول اکبر حیدرآبادی:

"فرخندہ رضوی نرم لہجے کی شاعرہ ہیں جو بڑی متانت ونزاکت سے شعر سناتی ہیں ان کی غزلیں نہ صرف سلیس وسادہ زبان میں ہوتی ہیں۔ بلکہ ان کے سچے جذبات کی ترجمان بھی، وہ اپنی کیفیات کو بغیر کسی آرائش لفظی یا صناعی کے سیدھے سادے الفاظ میں بیان کر دیتی ہیں" (70)

فرخندہ رضوی کو انسانی نفسیات کا گہرا شعور تھا۔ ان کی شاعری میں مقامی رنگ نظر آتا ہے۔ شعروں میں ترنم، شگفتگی، نغمگی کا خیال رکھتی ہیں۔ وہ چھوٹی اور بڑی بحریں استعمال کرنے کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ پاکیزگی خیال کے ساتھ ساتھ زبان کی صفائی بھی ضروری ہے۔ فرخندہ رضوی بیان کی چاشنی، روزمرہ اور محاورے کی تمام خوبیوں سے لیس نظر آتی ہیں:

سمجھو نہ غیر کا نہ کسی اجنبی کا ذکر
ہے میری داستان میں میری زندگی کا ذکر

(71)

معاشرے میں اگر امن وسکون کی فضا قائم ہو تو ایسا معاشرہ امن کا گہوارہ کہلائے گا لیکن اگر معاشرے میں ہر طرف دہشت گردی، ڈاکہ زنی، قتل وغارت اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوگا تو لوگوں کے اندر خوف وہراس کا پیدا ہونا یقینی بات ہے۔ لوگ ڈرے سہمے رہتے ہیں۔ ایسی فضا پر امن نہیں کہلائے گی۔

غربت وافلاس، خوف ڈر معاشی ناہمواری کے حالات جب لوگوں کے دلوں میں بسیرا کر لیتے ہیں۔ تو اس معاشرے سے خوشیاں مسکراہٹیں اور قہقہے رخصت ہو جاتے ہیں۔ ایسے ماحول میں لوگوں کی صلاحیتوں کو دیمک چاٹ جاتی ہیں۔ اور ایسے لوگ معاشرے کی ترقی کا باعث بننے کی بجائے ملک وقوم کا بوجھ بن جاتے ہیں۔ فرخندہ رضوی چونکہ ایک شاعرہ ہیں اور فطرتاً بھی بہت حساس اور نرم دل خاتون ہیں۔ وہ معاشرے کی اس حالت اور معاشرتی گراوٹ پر رنجیدہ اور دلی تکلیف سے دوچار ہوتی ہیں۔ انسانیت کے دکھ کو شدت سے محسوس کرتی ہیں۔ بقول سید معراجِ جامی:

"فرخندہ رضوی بھی ایک قلم کار ہے۔۔۔۔ اس لئے اس میں
شعور وادراک کی فراوانی ہے۔ وہ جس کو محسوس کرنا چاہتی ہیں
پوری شدت سے محسوس کرتی ہیں۔ جو حادثہ یا سانحہ گزرتا ہے۔
اس کا اثر پوری طاقت سے فرخندہ کی روح پر ہوتا ہے" (72)

شاعر اور فن کار کے سینگ نہیں ہوتے مگر وہ اپنے اردگرد کے ماحول، واقعات وحالات و

سانحات کو محسوس کر کے صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کے فن سے واقف ہوتا ہے۔

فرخندہ رضوی اپنے لوگوں کی خوشحالی کی تمنا رکھتی ہیں۔ وہ انسانیت کے لیے معاشرے کو جنت کے گہوارہ کی مانند دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ پیار و محبت کے پھولوں سے معاشرے کو سمجھانا چاہتی ہیں۔ تاکہ ان کلیوں کی بھینی بھینی مہک سے نہ صرف ہمارا معاشرہ بلکہ ہمارا ملک بھی معطر ہو جائے۔ ہر طرف امن وسکون ہو۔ ہر سمت امن کی بہار ہو تاکہ سماج صحیح معنوں میں ترقی کا گہوارہ بن جائے:

تیرے گلشن میں کھلیں میری تمناؤں کے رنگ
ہر طرف پیار کا چشمہ ہی ابلتے دیکھوں
تیرے رنگوں کی دھنک ایسے فلک پر چھائے
ماہ و انجم کو تیری چال سے چلتے دیکھوں
(73)

معاشرے میں بڑھتی ہوئی بد امنی، جگہ جگہ ظلم وستم کا بازار، افراتفری، لڑائی جھگڑے، دہشت گردی اور لوٹ مار کے مناظر انسان کو دکھی اور غمگین کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے جیسا سماج کا ماحول ہوگا اس کا اثر انسان پر ویسا ہی ہونا فطری امر ہے۔ دہشت گردی نہ صرف ہمارے مسلم سماج کا ناسور ہے بلکہ دنیا کے ہر سماج کا افسوسناک المیہ ہے۔ بحیثیت انسان سب کی خواہش ہے کہ وہ پرامن معاشرے کا باسی ہو۔ جہاں اسے نہ صرف پرامن زندگی حاصل ہو بلکہ زندگی کے تمام مسائل کا حل بھی اس کی دسترس میں ہو اور ایسی آسودہ زندگی کے لیے پرامن سماج کا ہونا ضروری ہے۔

سماج کا شہری شاعر حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ سب لوگ خوش ہوں، لوگوں کے تمام مسائل حل ہوں، لوگوں کی پریشانیوں کا خاتمہ ہو، ہر چہرہ ہنستا مسکراتا اور پرسکون دکھائی دے، مگر اس کے برعکس جب وہ سماج کی بدامنی اور مسائل ومصائب کو دیکھتا ہے تو ملول ہو جاتا ہے۔ بقول اظہر قادری:

"ادیب اگر اپنے فن میں سچا اور دیانت دار ہے تو وہ اپنے عہد
اور معاشرے کے بنیادی تقاضوں سے بھی چشم پوشی نہیں کر

سکتا۔ اپنے عہد کی ناانصافیوں، معاشی ناہمواریوں، محرومیوں،
طبقاتی ناہمواریوں اور استحصالی قوتوں کے خلاف آواز اٹھانا
ادیب کے فرائض میں شامل ہے"(74)

فرخندہ رضوی اپنی نظم "دہشت گردی" میں سماج کے ایسے ناسور وحشی درندوں کو حیوان کہتی ہیں۔ کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ انسان انسان پر اس قدر وحشیانہ ظلم نہیں ڈھا سکتا۔ جیسا کہ ان دہشت گردوں نے "سانحہ پشاور 16 دسمبر "2014 کو اپنے پاکستان کے مستقبل کے معماروں پر ڈھایا تھا۔ ایسے دہشت گرد انسان، انسان کہلانے کے لائق نہیں ہیں بلکہ وہاں والوں سے بھی بدتر ہیں۔ بقول فرخندہ رضوی:

خون آشام ہیں یہ وحشی درندوں کے ہجوم
جانے کتنوں کے ابھی اور کٹیں گے حلقوم
کتنے بارود کے شعلوں میں جلیں گے معصوم
کون سا شہر نشانے پہ ہے اب کیا معلوم
(75)

ایسے حیوان نما دہشت گرد جو ہمارے سماج کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ جینے کے حقدار نہیں ہیں جو دوسروں کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں۔ اور اس خونی راہ گزر میں وہ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ ان کی ایسی تخریب کاری سے بچے، جوان اور بوڑھے زندگی کی حرارت سے محروم ہو جاتے ہیں اور پیچھے ان کی ماں، بہنوں، بیویوں اور بیٹیوں کی آہ و بکار باقی رہ جاتی ہے، جو ایسے لوگوں کو نہ جینے دیتی ہیں نہ مرنے دیتی ہیں۔ ایسے لوگ دنیا اور آخرت میں ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1۔مولانا الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، سیونتھ سکائی پبلی کیشنز، لاہور، 2015ء، ص:6

2۔ایضاً، ص:14

3۔فرخندہ رضوی، خوشبوئے خندہ، بزم تخلیق ادب پاکستان کراچی 2018، ص:23

4۔سید معراج جامی، زیرلب، بزم تخلیق ادب پاکستان کراچی 2012، ص:30

5۔فرخندہ رضوی، زیرلب، ص:38

6۔القرآن، سورت نجم، آیت مبارکہ:39

7۔فرخندہ رضوی، زیرلب خندہ، ص:37

8۔ایضاً، ص:104 9۔ایضاً، ص:125

10۔فرخندہ رضوی خوشبوئے خندہ، ص:65

11۔شبلی نعمانی شعرالعجم (حصہ پنجم) الفیصل ناشران وتاجران کتب اردو بازار لاہور، جون 1999، 65 تا 66

12۔فرخندہ رضوی، خوشبوئے خندہ، ص:29 13۔القرآن، سورت احزاب، آیت مبارکہ:56

14۔فرخندہ رضوی، خوشبوئے خندہ، ص:30 15۔فرخندہ رضوی، زیرلب خندہ، ص:61

16۔ایضاً، ص:61

17۔ممتاز بنگلوری، مرتب، طیف غزل، لیکچرار از ڈاکٹر سید عبداللہ لاہور اکیڈمی لاہور، 1984ء، ص:54

18۔القرآن، سورت ال عمران، آیت مبارکہ:26

19۔فرخندہ رضوی، خوشبوئے خندہ، ص:81 20۔ایضاً، ص:37

21۔احمد ساقی، دروازہ مکتبہ قدوسیہ، لاہور، جون 2018ء، ص:85

22۔فرخندہ رضوی، خوشبوئے خندہ، ص:59 23۔ایضاً، ص:67

24۔القرآن، آل عمران، پارہ نمبر 4، آیت 185

25۔فرخندہ رضوی، خوشبوئے خندہ، ص:66

26۔ایضاً،ص:47 27۔ایضاً،ص:62

28۔فرخندہ رضوی، زیرلب خندہ،ص:50 29۔فرخندہ رضوی،خوشبوئے خندہ،ص:54

30۔ایضا،ص58 31۔فرخندہ رضوی، زیرلب خندہ،ص:57

32۔فرخندہ رضوی، زیرلب خندہ،ص: 96 33۔ایضاً،ص:180

34۔انور سدید ڈاکٹر اردو ادب کی مختصر، لاہور عزیز بک ڈپو، 1998ء،ص:56

35۔ پروفیسر محمود الحسن شاکر،خوشبوئے خندہ،ص16 تا17

36۔فرخندہ رضوی، زیرلب خندہ،ص،213 تا214

37۔ایضاً،79

38۔فرخندہ رضوی،خوشبوئے خندہ،ص،16 تا17

39۔ایضا،ص:164 تا165 40۔ایضاً،ص:178

41۔ایضاً،ص:179 42۔ایضاً،ص:180

43۔ایضا،ص:144 44۔ایضاً،ص:180

45۔فرخندہ رضوی،خوشبوئے خندہ،ص:104 46۔ایضاً،ص:105

47۔ایضا،ص:51 48۔فرخندہ رضوی،خوشبوئے خندہ،ص:166

49۔فرخندہ رضوی،خوشبوئے خندہ،ص:148 50۔فرخندہ رضوی، زیرلب خندہ،ص:166

51۔ایضاً،ص:80 52۔فرخندہ رضوی،خوشبوئے خندہ،ص:162

53۔فرخندہ رضوی، زیرلب خندہ،ص: 18 54۔فرخندہ رضوی، زیرلب خندہ،ص:130

55۔تاجور نجیب آبادی، آنکھیں ترستیاں ہیں، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس،9 گولا مارکیٹ نئی دہلی، 1974،ص21

56۔فرخندہ رضوی،خوشبوئے خندہ،ص:33 57۔فرخندہ،خوشبوئے خندہ،ص130

58۔کلیم الدین احمد، اردو شاعری پر ایک نظر، لاہور رحمانی پرنٹنگ پریس، 1985ء،ص7

59۔ایضاً،ص62 60۔ایضاً،ص136

61۔فرخندہ رضوی، زیرلب خندہ،ص133

62۔فرخندہ رضوی،خوشبوئے خندہ،ص59

63۔ایضاً،ص58

64۔ایضا،ص63 تا64

65۔فرخندہ رضوی،خوشبوئے خندہ،ص110

66۔ایضا،ص65

67۔ایضاً،ص90

68۔فرخندہ رضوی،زیرلب خندہ،ص107

69۔فرخندہ رضوی،خوشبوئے خندہ،ص45

70۔اکبرحیدرآبادی،زیرلب خندہ،ص27

71۔فرخندہ رضوی،زیرلب خندہ،ص157

72۔سیدمعراج جامی،زیرلب،ص29

73۔ایضاً،ص90

74۔اظہرقادری،سیپ،ماہنامہ،اکتوبر،نومبر،شمارہ نمبر54،کراچی،1996،ص24

75۔فرخندہ رضوی،زیرلب خندہ،ص114

☆☆☆☆☆☆

فرخندہ رضوی کا اختصاص

شاعری کسی کی ذاتی جاگیر اور میراث نہیں یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا تحفہ عظیم ہے۔ یہ امیری غریبی کو دیکھ کر نہیں ہوتی بلکہ یہ عطائے رحیمی ہے۔ فیضان الٰہی ہے۔ اردو شاعری کا کارواں جس نے اپنا سفر بارہویں صدی سے شروع کیا تھا اب اکیسویں صدی میں داخل ہونے والا ہے، اور شاعری کے اس سفر میں کئی اصناف شاعری مثلاً حمد، نعت، قطعہ، مرثیہ، رباعی، مخمس، مسدس، مثنوی، گیت، نظم، آزاد نظم، نظم مصریٰ اور غزل شامل ہو چکی ہیں۔ ان تمام اصناف شاعری میں سے کوئی صنف بھی ایسی نہیں جو اردو زبان ادب کی اپنی پیداوار ہو۔ یہ تمام اصناف فارسی، عربی اور انگریزی زبان وادب سے ہئیت اور موضوع سمیت مستعار لی گئی ہیں۔ ایک ادیب کی تشنگی چاہے وہ شاعر ہو یا افسانہ نگار قلم میں چھپی ہوتی ہے۔ لفظوں کے یہ خزانے ان لکھاریوں کے لیے اتنی ہی اہمیت کے حامل ہیں جتنے انسانوں کے لیے رشتے، کہتے ہیں کہ رشتے ٹوٹتے ہیں مگر گزرے وقت کے پل پھر بھی ساتھ ہی رہتے ہیں، پھر لکھنے والوں کا جو وقت لفظوں کی مالا بننے میں صرف ہوتا ہے وہ کہاں بھولتا ہے پھر یہ شاعری شاعروں کا سرمایہ اور ادب کا حصہ بن جاتی ہے۔ عہد حاضر کی اردو شاعری میں ایک جانا پہچانا نام فرخندہ رضوی کا ہے۔

ہمارے یہاں باقاعدہ طور پر شاعری کی عمر بڑی طویل ہے جو تقریباً تین سو سال ہے شاعری ہر دور میں مقبول عام رہی ہے تاریخ ادب میں مرد شعرا کی تو فہرست بڑی طویل ہے۔ لیکن شاعرات میں سے سب سے پہلے مہ لقاہ چندہ پہلی شاعرہ کے روپ میں سامنے آتی ہیں اس کے بحیثیت شاعرہ زہرہ نگاہ شعروسخن میں اپنی دھاک بٹھانے آئیں۔

عصر حاضر میں خواتین فن شعروسخن کی جانب کچھ زیادہ ہی مائل نظر آتی ہیں۔ پاکستان میں شاعری کی اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے پروین شاکر کشور ناہید فہمیدہ ریاض ادا جعفری اور شاہینہ فلک وغیرہ جیسی بلند مرتبہ شاعرات نے نام کمایا۔ ہندوستان میں بھی اس روایت میں پروفیسر عالیہ عنوان، ڈاکٹر زاہدہ زیدی، ڈاکٹر راحت سلطانہ، ترنم ریاض، رضیہ شبنم عابدی، بانو سراج اور بہت سی شاعرات کا درخشاں نظر آتا ہے۔ ان کے علاوہ یورپ امریکہ اور برطانیہ میں مقیم اردو

بستیوں میں بھی مردوں کے دوش بدوش خواتین بھی شعر وسخن کی محفلوں اور انجمنوں میں جلوہ افروز نظر آتی ہیں۔ جن میں پروین شیر، سلطانہ مہر، سفینہ صدیقی، صوفیہ انجم تاج، سمیہ عابدی، رخصتی، ڈاکٹر نیہاں، نجم شاہین، ڈاکٹر نگہت نسیم، نرگس جمال سحر، فرزانہ فرحت، عظمی صدیق اور ان جیسی بہت سی شاعرات کو بین الاقوامی سطح پر قدر ومنزلت کے ساتھ مانا گیا ہے۔ ان شاعرات میں فرخندہ رضوی ایسی نوخیز اور نو بہار شاعرہ ہے۔ جن کی موسم بہار جیسی تازہ شگفتہ، نازک ولطیف، گل رنگ اور عطر بیز شاعری و وجدانیت کے طلسماتی کیفیت سے سرشار ہوتی ہے جو نہ صرف دل کو بلکہ دماغ کو بھی شدت سے متاثر کرتی ہیں۔

فرخندہ رضوی اردو شاعری میں منفرد اور جدید لہجے کی شاعرات کی صنف میں کھڑی نمایاں نظر آتی ہیں۔ بطور شاعرہ فرخندہ رضوی نے انسانی رشتوں کے جذبات، پردیس کی تنہائی کا کرب اپنائیت وغیریت، دوستی، جدائی، وفا اور بے وفائی، آنسو، بے قراری، بے حسی، خودغرضی، غرضیکہ ہر قسم کے موضوعات پر لکھا ہے جو ہر جیتے جاگتے انسان کی زندگی کا اہم ترین حصہ ہیں جن کے بغیر زندگی ادھوری ہی نہیں نامکمل بھی ہے۔ شاعری کا مستقبل بہت شاندار اور وسیع ہے جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا بنی نوع انسان کو شاعری پر زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل ہوتا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ بڑا شاعر ہونا آسان نہیں ہے اگر آسان ہوتا تو اب تک بہت سے لوگ بڑے شاعر بن چکے ہوتے تاریخ کے ہر دور میں ایسے لوگ موجود رہے ہیں، جنہوں نے بڑا شاعر بننے کے لیے پرخلوص طریقے سے کوشش کی ہے۔ جن کو ہم بڑا شاعر کہتے ہیں ان کی الگ صلاحیتیں ہوتی ہیں ان میں انفرادیت اور نیا پن ہوتا ہے۔

قادر مطلق نے اس ویرانہ آبادی نما یعنی کارخانہ دنیا کی رونق اور انتظام کے لیے انسانوں کے مختلف گروہوں میں مختلف قابلیتیں پیدا کی ہیں تا کہ سب گروہ اپنے اپنے مذاق واستعداد کے موافق جدا جدا کاموں میں مصروف رہیں اور ایک دوسرے کی کوشش سے سب کی ضرورتیں پوری ہوں اور کسی کا کام اٹکا نہ رہے۔ اگر چہ ان میں بعض جماعتوں کے کام ایسے بھی ہیں جو سوسائٹی کے حق میں چنداں سودمند معلوم نہیں ہوتے۔ مگر چونکہ قسام ازل سے ان کو یہی حصہ پہنچا ہے اس لیے وہ اپنی قسمت پر قانع اور اپنی کوشش میں سرگرم ہیں۔ جو کام ان کی کوشش سے انجام ہوتا ہے۔ گو

تمام عالم میں اس کی وقعت نہ ہومگر ان کی نظروں میں وہ ویسا ہی ضروری اور ناگزیر ہے جیسے دیگر گروہوں کے مفید اور عظیم الشان کام تمام عالم کی نظر میں ضروری اور ناگزیر ہیں۔ کسان اپنی کوشش سے عالم کی پرورش کرتا ہے اور معمار کی کوشش سے لوگ سردی، گرمی، مینہ اور آندھی سے بچتے ہیں اس لیے سب کے نزدیک دونوں کے کام عزت اور قدر کے قابل ہیں لیکن ایک بانسری بجانے والا جو کسی سنسان ٹیکرے پر تن تنہا بیٹھا بانسری کی لے سے اپنا دل بہلاتا اور شائد کبھی کبھی سننے والوں کے دل بھی اپنی طرف کھینچتا ہے۔ گو اس کی ذات سے بنی نوع کے فائدہ کی چنداں توقع نہیں مگر وہ اپنے دلچسپ مشغلہ کو کسان اور معمار کے کام سے کچھ کم نہیں سمجھتا اور اس خیال سے اپنے دل میں اس خوش فہمی میں ہے کہ اگر اس کام کو سلسلہ تمدن میں کچھ دخل خیال نہ ہوتا تو خالق کائنات انسان کی طبیعت میں ان کا ذوق ہرگز پیدا نہ کرتا۔ شعر کی تاثیر سے کوئی انسان انکار نہیں کرسکتا۔ سامعین کو اکثر اس سے حزن، نشاط، جوش یا افسردگی کم یا زیادہ ضرور پیدا ہوتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اگر اس سے کچھ کام لیا جائے تو وہ کہاں تک فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

شاعری اکتساب سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ جس میں شاعری کا مادہ ودیعت ہوتا ہے وہی شاعر بنتا ہے شاعری کی سب سے پہلی علامت موزونی طبع سمجھی جاتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو اشعار بعض فاضلوں سے موزوں نہیں پڑھے جاتے ان کو بعض ان پڑھ، صغیر سن بلا تکلف موزوں پڑھ دیتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ شاعری اکتساب سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ بعض طبیعتوں میں اس کی استعداد خداداد ہوتی ہے۔ بس جو شخص اس عطیہ الٰہی کو مقتضائے فطرت کے موافق کام میں لائے گا ممکن نہیں کہ اس سے سوسائٹی کو کچھ نفع نہ پہنچے

ماضی حال اور مستقبل کو ہر بڑا شاعر ایک ہی لڑی میں پرو کر دیکھتا ہے۔ وہ حال میں رہتے ہوئے ماضی میں سانس لیتا ہے اور مستقبل تک رسائی رکھتا ہے۔ شاعر کے لیے زمانے سمٹتے سکڑتے رہتے ہیں اور اسے زمانوں کی کلیت پر دسترس ہوتی ہے۔ ماضی کے تجربات، حال کا حسی ادراک دلاتے ہیں اور مستقبل کے امکانات کی گرہ کشائی کرتے ہیں۔ ماضی کے دریچوں سے جھانکنا اور اس کے نقش دل پر تازہ کرتے رہنا ایک دلچسپ مشغلہ ہے فرخندہ رضوی کی غزل میں ماضی کی بازیافت، ہجرت کے سانحے اور وطن سے دوری کی داستانیں جڑی ہوئی ہیں۔

اردو ادب کو قدیم کے ساتھ ساتھ جدید تحقیق کاروں کی خدمات نے سجایا اور سنوارا ہوا ہے ہر تخلیق کار کو کسی ایک کام پر یا ایک صنف پر عبور حاصل ہے۔ جس کی واضع اور بڑی مثال میر انیس کی ہے جس کی وجہ شہرت ان کا "مرثیہ" ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی وجہ شہرت "نظم" ہے۔ اس طرح "غالبؔ و میرؔ" غزل کے حوالے سے جانے جاتے ہیں "آزاد نظم" کا سہرا محمد حسین آزادؔ، الطاف حسین حالیؔ اور میراں جی ون۔ م راشدؔ کے سر پر ہے۔ "قصیدہ" پر مرزا سودا براجمان نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں یہ اپنے وقت کے نامور شاعر ہیں جن کی عظمتوں کو آج بھی سلام کیا جاتا ہے اور جب تک اردو ادب کا وجود ہے شاعری ہوتی رہے گی۔ ایسے ناموں کو تازگی و تابندگی ملتی رہے گی۔ انہی نامور شعراء کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ایسے ہی تخلیق کاروں میں فرخندہ رضوی روشن صبح کی مانند جلوہ گر ہوتی ہیں۔ جنہوں نے اردو ادب کی کئی اصناف پر طبع آزمائی کی اور ہر صنف کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا۔ وہ نثر لکھتی ہیں۔ تو لاجواب، وہ شاعری کرتی ہیں تو بے مثال اور وہ گفتگو کرتی ہیں تو باکمال۔ انہوں نے ہمیشہ محنت کا دامن پکڑا ہے اور ہر صنف کے ساتھ مکمل طور پر انصاف کیا۔ تحقیق کی تو کمال کی اور شاعری کی تو لاجواب کی اور اپنے فن اور قلم کو منوایا۔ فرخندہ رضوی ہر فن میں ماہر دکھائی دیتی ہیں۔

فرخندہ رضوی کی تخلیقی جہتوں میں کچھ الگ بات ہے۔ اس کی بڑی وجہ کثرت مطالعہ ہے جس نے ان کے شعور کے در وا کئے۔ ایک شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات، احساسات اور جذبات کو الفاظ کے سانچے میں ڈالنے کی صلاحیت کا حامل ہو، سوچ کی پختگی اس کی شاعری سے چھلکتی ہو اور بلا شبہ یہ ساری خوبیاں بدرجہ اتم فرخندہ رضوی میں موجود ہیں۔ انہوں نے اپنی ان صلاحیتوں کو اپنے کلام کے اظہار کا ذریعہ بنا کر اپنا لوہا اہل قلم سے منوایا ہے۔ ان کی شاعری میں کہیں بھی مصنوعی پن کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کو بچپن ہی سے شاعری سے خاص لگاؤ تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لکھنے کے شوق نے دیوانگی کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد ہی شاعرہ اور ادبیہ کی حیثیت سے متعارف ہونا بنا لیا۔ اس لیے اردو ادب کی محبت و خدمت ان کا اولین مقصد بن گیا۔ اس لگن اور شوق کا یہ نتیجہ نکلا کہ ان کی پہلی کاوش "تصویر" میں اخبار خواتین میں شائع ہوئی۔

فرخندی رضوی کو جو چیز شاعری کے قریب لائی ہے وہ ان کا ذاتی ذوق وشوق ہے اور یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جس کام میں انسان کا ذوق وشوق اور ادبی وابستگی شامل ہو جائے تو وہ کام بہترین طریقے سے سرانجام پاتا ہے۔ وہ اعلیٰ ذوق کی حامل شخصیت ہیں۔ اچھے اشعار پڑھنا اور دوسروں کے کلام پر دل کھول کر تحسین پیش کرنا ان کی اچھی عادات میں سے ایک ہے۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ مطالعہ کو بہت ترجیح دیتی ہیں اس لیے کہ کثیر مطالعہ غور وفکر اور آگہی کا شعور دیتا ہے۔

فرخندہ رضوی نے اردو ادب کے سبھی نامور شعراء کی غزلوں، نظموں اور دیگر اصناف کا بے حد عمیق نظری سے مطالعہ کیا ہے اور ان کے انداز بیان پر بھی گہرا غور وخوض کیا ہے۔ انہوں نے بذریعہ مطالعہ اپنا ربط قدیم اور جدید دونوں قسم کے شعراء سے رکھا ہے۔ ایک اور خوبی یہ ہے کہ ان کا عصر حاضر کے شاعروں ادیبوں سے رابطہ سے دو پہلوؤں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ایک تو ان کی شعری دلچسپی کے بارے میں معلوم ہوتا ہے، اور دوسرا ان کی احباب نوازی کا پہلو بھی سامنے آتا ہے۔ وہ ایک سچی اور کھری شخصیت کی مالک خاتون ہیں۔ جس کا اندازہ ان کی تخلیقات سے بھی ہوتا ہے، اور ان کے قول وفعل سے بھی۔ یہ وہ اسباب ہیں جنہوں نے فرخندہ رضوی کو پختہ اور مثبت سوچ کی حامل شخصیت بنا دیا ہے۔ جو اردو ادب کے لیے حسین وبیش بہا سرمایہ ہیں۔

فرخندہ رضوی صرف اور صرف محبت کرنا جانتی ہیں اور محبت کا ہی درس دیتی ہیں۔ وہ سامنے والے کا مقام ومرتبہ اس کے علم سے طے کرتی ہیں نہ کہ دنیاوی عہدے اور مال ودولت سے۔ ان کی شاعری سے اردو ادب کو ایسی شاعری میسر آئی ہے جو حقیقت کو آشکار کرتی ہے۔ جس میں ذوق و شوق بھی ہے اور روایات کی پاسداری کا پرتو بھی برقرار رہتا ہے۔ یہ سب ان کی بے انتہا محنت کا نتیجہ ہے۔

فرخندہ رضوی ایک اعلیٰ درجہ کی شاعرہ ہیں۔ ان کی شاعری محض الفاظ کا تانا بانا نہیں اور نہ ہی انہوں نے شہرت کے حصول کے لیے شاعری کو ذریعہ بنایا۔ شاعری تو جذبات واحساسات کا اظہار ہے۔ محبت وشوق کا اظہار ہے۔ دکھ درد بیان کرنے کا وسیلہ اور غم والم بانٹنے کا ذریعہ ہے۔ ایک اچھا شاعر معاشرتی مسائل کو شعری پہناوے میں ڈھال کر پیش کرتا ہے اور اچھے شاعر میں ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے درد کو خود میں سمو کر اپنے جذبات کو لفظوں کے سانچے میں معاشرے

کے سامنے نہایت خوبصورت انداز میں بیان کرتا ہے۔ان کی شاعری روایات،تہذیب اور جدت تینوں کا حسین امتزاج ہے۔ان کی شاعری میں ایک انفرادیت ہے،جس کا اظہار اچھوتے انداز میں کیا گیا ہے۔ وہ غزل کی روایت کی منکر ہرگز نہیں لیکن غزل کی روایت کے ساتھ ساتھ نئے تجربات اور نظم میں نئے موضوعات کو اپنی شاعری میں خوب جگہ دیتی ہے۔وہ شاعری میں اجتہاد کی قائل ہیں۔وہ فرسودہ خیالات کو ایسے بیان کرتی ہیں کہ بالکل نیا اور تازہ محسوس ہونے لگتا ہے۔

فرخندہ رضوی کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں معاشرے کی تصویر کشی کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔اپنے مسائل کے متعلق جاننا اور اس کے حل کے لیے تگ و دو کرنا آغاز ہی سے انسان میں یہ جذبہ کسی نہ کسی صورت میں کارفرما رہا ہے۔اس لیے خصوصاً وہ شعراء جنھوں نے معاشرتی مسائل اور معاشرے کا ذکر کسی انداز میں کیا ہے۔ ہر دور کے نقاد نے اسے سراہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ معاشرے میں رہتے ہوئے کئی طرح کے مسائل کا سامنا ہر دور کے انسان کو رہا ہے۔ان کی شاعری میں بھی یہ تمام عناصر عیاں ہیں۔جن کا تعلق معاشرے یا سماج سے ہے۔ ان کے اشعار سے معاشرتی سوچ کا اندازہ ہوتا ہے،اور اس کرب کا احساس بھی جو ان کے ہر مصرعے ہر لفظ میں چھپا ہے۔

فرخندہ رضوی کی غزلیں اور نظمیں دور حاضر کے سیاسی ،معاشرتی، اخلاقی ،ثقافتی اور فکری مسائل کو بھرپور طریقے سے اجاگر کرتی ہیں۔ان کے فکر و فن کا سفر عروج پر ہے۔وہ انسانی جذبات و تجربات کو بڑے احسن انداز میں بیان کرتی ہیں۔ان کی شاعری عصری صداقتوں کو سامنے لاتی ہے۔ان کی شاعری انسانی مسائل و مصائب کو بہت خوبصورتی سے پیش کرتی ہے۔وہ اپنا ایک الگ اور منفرد اسلوب رکھتی ہیں۔

فرخندہ رضوی جدید غزل اور نظم کی نمائندہ شاعرہ ہیں۔ان کے ہاں معتدل لہجہ پروان چڑھتا نظر آتا ہے۔ان کے ہاں معاشرے کے بدلتے ہوئے حالات کا گہرا شعور ہے۔سادہ الفاظ میں گہری اور احساس سے بھری ہوئی باتیں کہنا ان کا خاصہ ہے۔فرخندہ کی شاعری دل پر اثر کرتی ہے۔ان کی شاعری پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ شاعری قاری ہی کہ لیے ہے۔وہ ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زندگی کی قائل ہیں۔ان کی شاعری مقصد کی شاعری

ہے۔ وہ شعروں کو محض تفریح و محبت و عشق تک ہی محدود نہیں رہنے دیتیں بلکہ شاعری کو زندگی کے اہم ترین مقاصد کے لیے بروئے کار لاتی ہیں۔ فرخندہ کی شاعری فکر کی شاعری ہے۔

فرخندہ رضوی غزل کی ساخت و پرداخت سے خوب واقف ہیں انہوں نے غزل اور نظم کی جھولی کو مختلف انواع و اقسام کے پھولوں اور رنگوں سے بھرنے کی سعی و کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری کی تخلیق کے محرکات، اردگرد کے حالات، رنگ بدلتے مزاج، منافق لوگ، اپنوں کے دیئے زخم اور خودغرضی، سیاست دانوں کی بے حسی، امیروں کے ظلم و جبر اور منافقت، سماجی ناانصافی، غربت کے مارے لوگوں کے حالات اور حاکموں کی ستم ظریفی جیسے موضوعات ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی غزل عشق و محبت، وطن پرستی، انسان دوستی، احساس دین و دنیا، واعظ و نصیحت، ظلم و جبر اور عصر حاضر کے تمام تقاضوں سے بھی مزین ہے۔

فرخندہ رضوی کی شاعری کی خصوصیات میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ وہ بیحد آسان اردو کا استعمال کرتی ہیں۔ اگرچہ وہ برطانیہ کے شہر ریڈنگ میں رہائش پذیر ہیں اور وہاں انگریزی زبان کا بول بالا ہے مگر باوجود اس کے انہوں نے اردو کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا اور اردو ادب کی محبت کو سینے سے لگائے آج بھی اردو کی آبیاری کرنے میں پوری تندہی سے کوشاں ہیں۔ عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ جو خواتین یورپی ممالک میں جا بسیرا کرتی ہیں۔ ان میں ڈالر اکٹھا کرنے اور دنیاوی آسائشوں کے حصول کے علاوہ کوئی خاص مقصد نہیں ہوتا۔ کچھ بیچاری گھریلو مسائل میں اس قدر الجھ جاتی ہیں کہ انہیں ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا ہوش ہی نہیں رہتا۔

فرخندہ رضوی اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ انہیں گھر اور گھر سے باہر ایسا ماحول میسر آیا جس میں وہ اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار کر سکتی ہیں۔ ان کا ذہن بہت متحرک ہے۔ وہ اپنے احساسات، جذبات، خیالات اور تجربات کو پوری ایمانداری سے صفحہ قرطاس پر بکھیرتی چلی جاتی ہیں۔ ان کے شعور کی کئی پرتیں ہیں۔ جو ان کی روح کو مضطرب رکھتی ہیں۔ کہیں وہ افسانہ لکھ کر تسکین دیتی ہیں، کہیں غزل لکھ کر اپنے اندرونی کرب و ملال کا اظہار کرتی ہیں۔ کہیں نظم لکھ کر انہیں سکون ملتا ہے اور کہیں کالم لکھ کر اپنے موجودگی کا احساس دلاتی ہیں۔ ان کی سوچ کا سمندر ساکن نہیں بلکہ اس میں بہاؤ کی سی کیفیت ہے۔ وہ اس بہاؤ میں چھلانگ لگا دیتی ہیں اور ہلچل مچا کر

باہر نکل آتی ہیں۔ ان کے ذہن کے پردوں پر جو الفاظ نمودار ہوتے ہیں۔ وہ انہیں نوک قلم سے کاغذ پر نقش کرتی جاتی ہیں۔ وہ عام شعرا کی طرح مشکل الفاظ کو استعمال کر کے قاری کو اپنی شاعری سے دور نہیں کرتی ہیں اگر آج کل لوگ شاعری سے دور ہیں تو اس کے ذمہ دار بھی خود شاعر حضرات ہیں۔ وہ اس طرح کہ انہوں نے شاعری کو اتنا پیچیدہ کر دیا ہے کہ قاری نے شاعری میں دلچسپی لینا چھوڑ دی ہے۔ ہمارے یہاں جو اردو بولی جاتی ہے۔ شاعری اردو سے نہ صرف ہٹی ہوتی ہے بلکہ اس کے خلاف نظر آتی ہے۔ اب یہ لازم تو نہیں ہے کہ شاعری پڑھنے والا اردو دان ہی ہو، اس طرح عام فہم والا آدمی سوچتا ہے کہ شاعری وغیرہ وقت کا ضیاع ہے۔ اس لیے عام آدمی شاعری سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ مگر فرخندہ رضوی یہ بات جانتی ہیں کہ لوگ آسان شاعری کو سمجھ کر داد دینے کا ہنر جانتے ہیں۔

انہوں نے الفاظ کے قبیل میں سے ایسے الفاظ کا چناؤ کیا جو عام بول چال کے الفاظ ہیں۔ جن کو لوگ آسانی سے بول اور سمجھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دیگر شعراء سے منفرد نظر آتی ہیں اور ہم عصر شاعرات میں اپنا نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ فرخندہ رضوی کی شاعری میں ایک کمال یہ بھی ہے کہ روایات کی پاسداری کرتے ہوئے صرف ان کا لہجہ ہی جدید نہیں بلکہ ان کی سوچ و فکر جدید ہے۔ وہ بدلتی ہوئی سائنسی، جغرافیائی، معاشرتی اور تہذیبی صورتحال کو قریب سے دیکھتی ہیں اور پھر سوچ و فکر کو اس طرف لگا دیتی ہیں اور پھر گوہر نایاب کی صورت میں ان کو پیش کر دیتی ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جدید رویوں کا خاص خیال رکھا ہے۔ اگرچہ روایات کی پابند ہیں۔ مگر ترقی کی مخالف بھی نہیں ہیں۔ وہ اس سوچ کی حامل شخصیت ہیں کہ اردو ادب کو اپنی رفتار تیز کرنی چاہیے۔ وقت کے ساتھ ہر چیز بدلتی ہے اور یہی تبدیلی دراصل جدت کہلاتی ہے۔ فرخندہ رضوی نے اپنی شاعری میں جدید رویوں کو روشناس کروایا ہے۔ ان کی شاعری میں روایات کی پاسداری بھی ہے اور جدید رویوں کی عکاسی بھی ہے۔ اور یہ ایک ایسا ہنر ہے۔ جس نے ان کی شاعری کو اردو ادب میں اعلیٰ مقام و مرتبہ فراہم کیا ہے۔

شاعری میں بہت کچھ کہہ کر بھی کچھ نہ کہنے کا رجحان عام ہے۔ یعنی اپنا مقصد بیان بھی کرنا مگر ڈھکے چھپے الفاظ میں۔ اسی طرح معاشرتی ناانصافیوں کو دیکھ کر شاعر کا حساس دل دکھتا ہے۔ اور پھر وہ ایسا کچھ کہہ جاتا ہے جو اس ناانصافی کے خلاف ہوتا ہے۔ فرخندہ رضوی نے بھی معاشرے

میں موجود نا انصافیوں پر آواز اٹھائی ہے۔انہوں نے اپنی توانائیوں کا استعمال غلط سمت میں نہیں کیا بلکہ درست سمت کا تعین کر کے درست راستہ اختیار کیا اور معاشرتی مسائل کو اپنے اشعار میں ڈھالنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔

فرخندہ رضوی کی شاعری میں بیک وقت مصنوعی شکوہ جذبات کی فراوانی اور تازہ کاری قاری کے دل کو موہ لیتی ہے۔انہوں نے اظہار فن کے لیے نئے نئے گوشے نکالے ہیں۔ان کی شاعری ابہام سے پاک ہے۔ان کی ہر غزل ان کے اپنے تجربات کی صداقت کا ثبوت ہے۔دور حاضر میں جب اکثر شعرا اپنی عوامی مقبولیت کے لیے ہزاروں قسم کے جتن کرتے ہیں اور اپنی شاعری میں اجنبی قسم کے الفاظ اور ردیف وقوافی میں ذہن کو منتشر کرنے والے الفاظ لاتے ہیں۔فرخندہ رضوی کے ہاں غیر مانوس قسم کے الفاظ نظر نہیں آتے۔یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام پڑھ کر دلی سکون محسوس ہوتا ہے۔

ہر عہد میں بہت سی سماجی وسیاسی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔بڑے بڑے سانحے رونما ہوتے ہیں۔ایک ادیب اور شاعر ان پر گہری نظر رکھتا ہے اور منفرد انداز میں بیان کرتا ہے۔چونکہ شاعر بہت حساس دل کا مالک ہوتا ہے۔وہ دوسروں کے غم بھی اپنے اندر سمو لیتا ہے۔پھر اس غم کو لفظوں کے سانچے میں ڈھال کر اپنی شاعری میں بیان کرتا ہے۔فرخندہ رضوی نے اپنے عہد کے سب سے بڑے مسئلے دہشت گردی کا نہایت عمیق نظری سے مشاہدہ کیا ہے اور پھر اپنی نظموں اور غزلوں میں بڑے احسن طریقے سے بیان کیا ہے۔شاعری میں کوئی پیغام نہ ہو تو رنگ اور ذائقہ پھیکا پڑنے لگتا ہے لیکن فرخندی رضوی نے اپنی شاعری میں اس کڑواہٹ کو شامل نہیں ہونے دیا۔ان کی شاعری میں انسانیت کا احترام بھی ہے اور حرکت وعمل کا پیغام بھی ہے اور یہ کہ ان کی شاعری میں اصلاحی پیغام بھی موجزن ہے۔

فرخندہ رضوی کی شعری خصوصیت میں اخلاقی قدروں کی بھرپور عکاسی ہمارے سامنے آتی ہے۔انہوں نے ایسی شاعری کی جو اخلاقی قدروں سے ہم آہنگ ہے۔آج کل نوجوان اخلاقیات سے انجان ہیں اور اخلاقی اقدار کی پاسداری کو ضروری نہیں سمجھتے حالانکہ اخلاقیات کا کسی بھی معاشرے کے قیام کے لیے ہونا بے حد ضروری ہوتا ہے۔اس لیے ہر دور کے شاعر اور ادیب کا فرض ہے کہ وہ اس دور میں موجود تمام بری عادات کے خلاف اور اچھی اقدار کے لیے آواز بلند کرے۔

فرخندہ رضوی نے بھی اسے اپنا فریضہ سمجھتے ہوئے بخوبی سرانجام دیا ہے۔ان کی شاعری سے اخلاقیات کی تعلیم ملتی ہے۔حقیقی شاعر پیدا تو ماں کے پیٹ سے ہوتا ہے۔لیکن اس کی پرداخت اور شعری تہذیب اسی ماحول میں ہوتی ہے جس میں وہ رہتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ شعری تخلیق کے لیے خیال ہی بنیاد ہے اور اسی حوالے سے شعر لکھنے نہیں بلکہ شعر کہنے کے لیے خیالات کی فراوانی اہم ترین عنصر ہے۔جس کے بعد طبیعت کی موزونیت،علم کی ضرورت،مطالعہ اور مسلسل مشق شاعر کو شعر کہنے کے قابل بناتے ہیں۔

فرخندہ رضوی شعر کہنے میں کوئی منصوبہ بندی نہیں کرتیں بلکہ خیال جس قالب میں خود ڈھلنا چاہتا ہے اسی میں ڈھال دیتی ہیں جو ایک خداداد صلاحیت ہے۔فرخندہ رضوی کی شعری انفرادیت کا اندازہ اس وقت یقین میں بدل جاتا ہے۔جب ان کے شعری نسخوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ان کی شاعری آنکھوں کے راستے دل میں اترتی ہے۔انہوں نے محبت کے ایسے انداز بیان کیے ہیں جو عشق کو چھوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ان کی شاعری میں اخلاق کی خوشبو کا احساس بھی ہے۔ رونق کے سامان بھی،احترام بھی ہے اور جذبوں کی بے باکی اور ہیجانی کیفیت بھی ہے۔جوانی کی کروٹیں اور محبوب سے شکوہ وشکایت بھی ہے مگر مایوسی کی جگہ امید کا دامن تھامے نظر آتی ہے۔ بلا شبہ اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ فرخندہ رضوی ایک منفرد لہجے کی شاعرہ ہیں اور وہ اردو ادب میں اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہیں۔

مذہب انسان کی زندگی میں بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ہر مسلمان کو اپنے مذہب سے بے حد لگاؤ ہوتا ہے۔جس کا اظہار احکام شریعت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔مگر شاعر یہ ساری صورتحال اپنی شاعری کے ذریعے اپنے مخصوص انداز میں پیش کرتا ہے۔وہ اپنی محبت وشوق اور عقیدت کے اظہار کے لیے مختلف پیرائے وضع کرتا ہے۔ ہر مسلمان کے لیے حضرت محمد ﷺ کی شان اقدس ایسی ہے۔جس سے وہ سب سے زیادہ محبت واحترام کرتا ہے۔فرخندہ رضوی نے بھی اسی بات کا ثبوت دیا ہے۔اور انہوں نے نہایت عمدہ انداز میں اپنی شاعری کے ذریعے آپ ﷺ کی شان اقدس میں نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے جو کہ ان کا اسلام کے ساتھ لگاؤ کا غماز ہے۔ہم ایک ایسے معاشرے میں سانس لے رہے ہیں جہاں نفرتوں کی ہواؤں کا زور روز بروز بڑھتا ہی جا

رہا ہے۔محبت کے چراغ گل ہو رہے ہیں۔انسان اپنے مقام و مرتبے سے بے حد نیچے گرتا جا رہا ہے۔کسی کو سراہنا،اس کے کام کی تعریف کرنا ہمارے بس کی بات نہیں رہی اور نہ ہی اتنا ظرف ہے کہ خوش دلی سے کسی چیز کی تعریف کر سکیں۔مگر اس کے برعکس کسی کام میں نقص اور عیب نکالنا آسان ترین لگتا ہے۔اس عمل نے جہاں معاشرے میں بداعمالیوں کو جگہ دی ہے۔وہاں ادب کو بھی بہت بری طرح متاثر کیا ہے۔اس لیے ادب میں اب ادیب اور شاعر بھی سیاسی سوچ کے حامل ہو گئے ہیں۔منہ پہ تعریفوں کے پل باندھتے جاتے ہیں اور پیٹھ پیچھے سو سو عیب نکالتے جاتے ہیں۔فن کی پرورش دراصل ان تمام نظریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے زمینی رشتوں کے آئینے میں ہی ممکن ہے۔لوگوں کے مفادات کو گننے لگیں تو ادب زندہ نہیں رہ سکتا۔لیکن دور حاضر میں لوگوں کے رویوں نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ اب ادب تعلقات عامہ کا محتاج ہو گیا ہے۔

فرخندہ رضوی نے اس روایت کو ختم کرنے کی بھرپور عملی کوشش کی ہے۔وہ ہم عصر لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتی ہیں اور کھلے دل سے سراہتی بھی ہیں اور پچھلے شعرا اور ادبا کے کام کی مداح بھی ہیں۔یہ خوبی ان کی ذات میں رچی ہوئی ہے۔وہ ان تخلیق کاروں کو خراج عقیدت پیش کرتی ہیں جنھوں نے اردو ادب کے لیے اپنی خدمات کسی نہ کسی حوالے سے پیش کیں۔فرخندہ رضوی نے جن شخصیات کے فن کی تعریف کی ہے ان میں علامہ اقبالؔ،غالبؔ،ناصرؔ کاظمی،منیرؔ نیازی،فیض احمد فیضؔ،پروین شاکر وغیرہ شامل ہیں۔فرخندہ رضوی نے غزل سے پہلے نظم میں عمدہ طبع آزمائی کی ہے۔انہوں نے نظم کو ایک نئے روپ میں پیش کر کے اردو ادب کی اس صنف کو اہمیت دلانے کی کوشش کی ہے۔نظم پر غزل کی نسبت کم کام ہوا ہے۔ہر دور میں غزل کو زیادہ فوقیت حاصل رہی ہے۔لیکن فرخندہ رضوی نے اپنی شاعری کی ابتدا ہی نظم "تصویر" سے کی جو انسانیت کے نام پر لکھی اور انسانیت کے درد میں لکھی۔اس طرح نظموں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا اور انہوں نے متنوع موضوعات نظم میں سمو کر پیش کیے۔ان کے شعری مجموعے " سنو خموشی کی داستان "" فاصلے ستارے میں " میں شامل نظمیں عید کیوں چلی آئی،رشتوں کی برسات،اک سچ، جدائی پیار کا نام ہیعید،تحفہ،پہلی سی محبت کہاں ہے،آنسو،سفر،لوٹ آؤ،آؤ سالگرہ منائیں،یہ کیسی محبت ہے،دعا،محبت،چاند تمہی تو ہو،تصویر،یادیں،بے وفا سے وفا،حسرتیں،برا لگتا ہے،بکھرا

سمندر، ماہ محرم، اک ماں، التجا، دھوپ کا نام جو سایہ ہے، محبت جوگی ہے، سانحہ پشاور، آج کی عوورت، وطن، سال نور، مٹی کا ڈھیر، (ماں کی برسی) تجدید عشق، خالی ہاتھ، نہیں محبت اب تم سے، یادیں، محبت کیا ہے آخر؟، فریبی وغیرہ وغیرہ ہیں۔انہوں نے محنت اور لگن سے شعراء میں اپنا ایک الگ مقام بنا رکھا ہے۔انہیں ادب کی تمام اصناف سے دلچسپی ہے۔انہوں نے ماحول، حالات، معاشرتی مسائل، تلخ حقیقتوں اور معاشرے میں ناانصافیوں کی ترجمانی کی عکاسی کی ہے۔

برطانیہ میں اردو زوال پذیر نہیں بلکہ پوری توانائی کیساتھ زندہ ہے۔اس کا مستقبل تابناک ہے۔دیار غیر میں گوروں کے دیس میں اردو آج بھی مقبول و معروف ہے اور اردو سے محبت کرنے والے تخلیق کار ادیب اور شاعر کی حیثیت سے اپنے خون سے اس کی آبیاری کرنے میں تن، من، دھن سے سرگرداں ہیں اور فرخندہ رضوی اس کار خیر میں سرفہرست شامل ہیں۔نظموں کے تمام موضوعات بے حد منفرد اور معاشرتی مسائل پر مبنی ہیں۔جنہوں نے فرخندہ رضوی کو عوامی اور معاشرتی شاعر بنا دیا ہے۔اس کی بہت سی وجوہات ہوں گی مگر فرخندہ رضوی درد دل رکھنے والی شاعرہ ہیں اور اس کی سب سے بڑی وجہ یقیناً ان کا لوگوں سے ربط، معاشرتی حالات سے واقفیت، اور معاشرے میں بسنے والے لوگوں کا درد ہے۔جب تخلیق میں اس قسم کی سچائی مل جائے، تو وہ اور جاذب نظر اور دلکش ہو جاتی ہے۔

فرخندہ رضوی نے بھی ایسے ہی، صاف اور پاک جذبات و احساسات سے کام لیا ہے۔ انہوں نے نظموں کے موضوعات کا انتخاب اور چناؤ بے حد سوچ سمجھ کر کیا ہے۔انہوں نے اپنے جدید خیالات کو بڑے احسن انداز میں نظم کے ذریعے بیان کیا ہے۔ان کی نظموں میں محض الفاظی نہیں ہے بلکہ ہر خیال کو عمدگی سے پیش کرنا فرخندہ کا کمال ہے۔شعر کسی بھی زبان کا ہو اس میں سب سے زیادہ عمل دخل زبان کا ہوتا ہے اگر زبان پر عبور و مہارت ہو تو کہنے والے کا قد شعرا میں بلند ہو جاتا ہے۔شعر میں اسلوب زبان کا کردار اتنا ہی اہم ہے جتنا ہماری زندگی میں آکسیجن کا ہے۔جس طرح آکسیجن کے بغیر زندگی کے آثار ختم ہونے کا خدشہ ہوتا ہے ایسے ہی اگر شعر میں زبان کا درست استعمال نہ ہو تو شعر کے بھی مرنے کا خطرہ ہوتا ہے۔قدیم شعرا میں یہ روایت اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔لیکن فرخندہ رضوی نے زبان کا حلیہ بگڑنے نہیں دیا بلکہ اسے ہر طرح سے قائم و دائم

رکھا اور اشعار کو اصل شعری رنگ میں تخلیق کیا۔ انگریزوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی خالصتاً اردو کی تخلیق کی اور اس میں انگریزی زبان کی ملاوٹ بالکل نہ کی حالانکہ گوروں کے دیس میں ان کی زبان بولنی پڑتی ہے۔ اگرچہ فرخندہ رضوی نے "جیسا دیس ویسا بھیس" والا اصول بھی اپنایا مگر اپنے وطن کی محبت اور اردو ادب سے لگاؤ کے سبق کو کبھی نہ بھول پائیں۔ اسی بنا پر اردو زبان سے محبت کر کے اسے اس انگریزی زدہ دور میں زندہ و تابندہ رکھنے میں بے حد اہم کردار ادا کیا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ جو اسلوب ان کے لہجہ کی بنیاد ہے وہ نہایت لطیف اور سادہ انداز سے ان کے شعری تجربے میں ڈھل گیا ہے۔ اسی سے ان کے باطنی جذبے کو تحریک دینے والے اشعار نمودار ہوتے ہیں۔ جن میں سچائی نظر آتی ہے۔ جو کسی بھی تصنع اور بناوٹ سے پاک ہے۔ فرخندہ رضوی بلاشبہ ایک بہترین شاعرہ ہیں۔ جو شعری اسلوب اور اردو زبان سے آگاہی و واقفیت کا شعور رکھتی ہیں۔ ان کی شاعری ایسے عمدہ رنگوں میں ڈھلی ہوئی ہے کہ ہر رنگ پختہ پائیدار، اعلیٰ اور مضبوط تر نظر آتا ہے۔ اگر ان کی شاعری کا موازنہ عہد حاضر کے شعرا کے ساتھ کیا جائے تو ان کا قد کاٹھ عصر حاضر کے شعرا میں نمایاں نظر آتا ہے۔

فرخندہ رضوی سچے جذبات اور رشتوں کی ترجمانی کرنے کے لیے اپنی دلی کیفیت کو آرائش لفظی میں ڈال کر بیان نہیں کرتیں بلکہ سادہ سے لہجے میں اپنی بات کہہ جاتی ہیں۔ افسانہ، شاعری، دونوں ایسے کام ہیں۔ جو ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے کیونکہ ان دونوں کاموں کے لیے مطالعے، علم، تجربے اور تجزیہ پیدا کرنے کی صلاحیت کے علاوہ ایک حساس دل، وسیع النظری، باریک بینی، روشن ذہن اور تازہ اور پاکیزہ سوچ کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ اگر کسی میں یہ سب اوصاف موجود ہوں گے تب ہی وہ ایک اچھا شاعر اور اچھا افسانہ نگار بن سکتا ہے اور فرخندہ رضوی میں یہ خوبیاں موجود ہیں۔

دور حاضر میں مسئلہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جسے فکشن یا شاعری لکھنا آ گئی وہ اپنے آپ کو افسانہ نگار یا شاعر سمجھنے لگتا ہے۔ اس لیے ہر طرح کی تحریر چاہے وہ کسی واقعہ کی رپورٹ ہو یا کسی واقعہ پر اظہار خیال ہو یا کوئی شعری قطعہ ہو اسے زبردستی شاعری یا مقالے کا نام دے کر چھاپ دیتے ہیں۔ ایسے دور میں اگر کوئی تخلیق کار اچھی شاعری یا افسانہ لکھے تو اس کی انفرادیت اور سچائی خود ہی

سب کو اپنی طرف کھینچ لینے کی مقناطیسی صلاحیت رکھتی ہے۔ فرخندہ رضوی کی شاعری میں ان کا علم، فہم، تجربہ و ادراک، سماجی شعور انداز تصوف اور جدید خیالات کا منطقی بہاؤ، شاعرات کے اس ہجوم بیکراں میں ان کی الگ اور جداگانہ شناخت کرانے کے لیے کافی ہے۔

فرخندہ رضوی کی حمد و نعت میں جو وجود ملتا ہے۔ اس میں تصوف بھی ہے اور ذکر میں اکثر اپنے خدا سے ہم کلام ہوتی ہوئی جس منزل اور معرفت پر نظر آتی ہیں۔ وہ ایک اکمل شخصیت میں ہی ہوسکتا ہے۔ حمد یا نعتیہ اور دعائیہ نظمیں ان کے دل کے سچے اور کامل مذہبی جذبوں کی عکاس اور امیں ہیں۔ ان کو پڑھو تو ایسا لگتا ہے کہ ان کے سر پر جبرئیل کا سایہ ہے۔ لیکن سچ پوچھیں تو یہ بھی بہت بڑی خوبی ہے کہ کوئی دنیادار ہونے کے ساتھ ساتھ دین دار بھی ہو۔ فرخندہ رضوی شاید راہ رب میں شب بیداری کے کنویں سے پانی حاصل کرنے والی سیدھی سادھی خانم، ایک گھریلو زندگی، سعادت مند بیٹی، خدمت گزار بیوی، شفیق ماں، مخلص دوست ہونے کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار، مقالہ نگار، کالم نگار، اور شاعرہ بھی کمال کی ہیں۔ وہ حمد و نعت کے ذریعے سماجی شعور دیتی ہیں کہ اپنے مسائل کے لئے خدا اور اس کے رسول ﷺ سے قرآن مجید اور احادیث مبارکہ کے ذریعے رہنمائی حاصل کریں۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اپنی دینی اور دنیاوی ذمہ داریاں پوری کرنے کے بعد اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے لیے وقت کہاں سے نکالتی ہیں۔ جب ان کی طبیعت کسی بات سے متاثر ہوتی ہے، اور کوئی خیال، پیکر کا وجود پانے کے لیے ان کے ذہن میں نظر آتا ہے تو وہ اسے صفحہ قرطاس کے سپرد کرنے میں دیر نہیں کرتی ہیں۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فرخندہ رضوی عصر حاضر کی وہ شاعرہ ہیں جن کے من میں لفظوں کا ایک طوفان موجود ہے جو اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکیوں اور مایوسیوں کی بصیرت رکھتی ہیں۔ آپ گو غزل کی شاعرہ ہیں مگر نظم بھی نہایت خوبصورت لکھتی ہیں۔

فرخندہ رضوی ایسی ہمہ جہت اور ہمہ رنگ شاعرہ ہیں۔ جو شعر و ادب کے گوناگوں مراحل کی تسخیر میں مصروف عمل نظر آتی ہیں۔ وہ حمد و نعت، نظم و غزل اور قطعات میں اپنا زور سخن صرف کرتی ہیں وہ خوبصورتی کی منہ بولتی تصویر ہیں اور اس سے بھی زیادہ حسن ان کی ذات کے بطون میں

پوشیدہ ہے۔ جو اپنی نمود و ظہور کے لیے انہیں تخلیق کے عمل پر اکساتا رہتا ہے۔ شاعری سے ان کی ہم رشتگی کی وجہ بھی اصل میں یہی ہے یہ مذکورہ حسن ان کی ذات خاص سے منتقل ہو کر ہمیں ان کی تخلیقات کے ساغر سے چھلکتا اور دعوت مطالعہ دیتا نظر آتا ہے۔ فرخندہ رضوی لکھنے والوں کے اس قبیل سے تعلق رکھتی ہیں۔ جن کے کشکول سخن میں اپنے بزرگوں، خاندانوں، اور ہم سفر سے ملنے والی کوئی نعمت شامل نہیں۔ گویا سخن گوئی کا یہ بیج بویا بھی خود اس کی آبیاری بھی خود کی۔ اس کی نگہداشت بھی خود کی اور پروان بھی خود ہی چڑھایا اور آپ ایک رخ سے اس کا پھل بھی خود ہی کھا رہی ہیں۔

شاعری فرخندہ رضوی کے نزدیک شہرت کا اشتہار ہے اور نہ تعلقات قائم کرنے کا زینہ ہے۔ وہ صرف اس لیے لکھتی ہیں کہ قلم کے خالق نے یہ لکھنے کا فریضہ ان کے سپرد کر رکھا ہے ورنہ تو ان کے خاندان میں پہلے کسی نے لکھا اور نہ ہی آگے ایسا کوئی امکان نظر آتا ہے۔ ماسوائے اس کے کہ معجزہ کبھی اور کہیں بھی رونما ہو سکتا ہے۔ فرخندہ رضوی نے شعر لکھتے ہوئے ننانوے فیصد بناوٹ سے کام نہیں لیا اس فطری طرز عمل میں شاعری کے کچھ فن محاسن قربان ہی کیوں نہ کرنے پڑے ہوں شجر کاری کی دنیا میں جن پودوں کو کیکٹس کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ سو فیصد خودرو ہوتے ہیں۔ ماہرین شجر کاری کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ روئے زمین پر یہ کیکٹس ریگستان میں کھلتا ہے جہاں پانی نایاب اور شدت آفتاب سوا نیزے پر ہوتی ہے۔ فرخندہ رضوی کی شاعری میں ایک عنصر اچھوتا اور منفرد لگتا ہے کہ کانٹوں کے باوجود اس میں کیکٹس کے پھولوں کا تناسب زیادہ ہے۔

شاعری کی قدر و قیمت کا فیصلہ وقت کرتا ہے۔ یعنی تاریخ اور قارئین کرتے ہیں۔ اتنا بحرحال طے ہے کہ فرخندہ رضوی اپنی انسان دوستی وطن پرستی اور دیار غیر میں بیٹھ کر اردو کی آبیاری کرنے پر اور پاکستان کے لوگوں کی دردمند کے لیے یاد رکھی جائیں گی۔ کسی بھی چیز کا مقام و مرتبہ اس کی خوبیوں اور انفرادیت کی بنیاد پر رکھا جاتا ہے۔ یہ تو طے ہے کہ ہر شے اپنے اندر کوئی نہ کوئی خوبی سمیٹے ہوتی ہے۔ چیز کی صلاحیتوں کا اظہار ان کی خصوصیات کی بنا پر ہوتا ہے۔ شعر و ادب کی بات کریں تو شعر و ادب اگر اپنے اصلی رنگ میں ہوں تو اس سے بہتر شے ہی نہیں ہوتی اس لیے کہ جذبات احساسات، کا اظہار جس ترتیب اور خوبصورتی سے شعری ادب میں کیا جاتا ہے کسی اور

میں نہیں کیا جا سکتا۔ فرخندہ رضوی کی شعری جہتوں کا مطالعہ کریں تو یہ بات روز روشن کی طرح سامنے آتی ہے کہ انہوں نے جذبات واحساسات کو بڑے خوبصورتی سے شعری پہناوے پہنا کر پیش کیا ہے ان کے اس منفرد انداز نے قارئین کے دل موہ لیے ہیں فرخندہ رضوی کی شاعری بلاشبہ بلند پایہ کی شاعرہ ہیں۔ ان کی شاعری سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ شعری ادب کی ماہر کاریگر ہیں۔ انہوں نے ہر مقام پر اس مہارت کو احسن انداز میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے شعری اسلوب کو زندہ رکھ کر اور ساتھ ہی عروض اور بحر و وزن کا خیال رکھتے ہوئے نہایت عمدہ شاعری تخلیق کی ہے اور عروض کی بنیادی معلومات کو ہی اساس بنا کر بیشتر شعرا کی طرح اپنی شاعری کا تاج محل کھڑا کیا ہے۔

فرخندہ رضوی جنہیں اکبر حیدر آبادی، خالد یوسف (مرحوم) صفدر ہمدانی، ڈاکٹر مختار الدین احمد بانو ارشد، مہر سلطانہ اور راحت زاہد جیسے اکابرین وصالحین کی سرپرستانہ حمایت اور حوصلہ افزائی حاصل ہے۔ جو بڑی بات ہے۔ نیک باطن، عجز وانکساری کی مجسمہ خوش مزاج اور شیریں سخن فرخندہ کی شاعری اول تا آخر مہر ومحبت، مروت وشفقت، اعانت والفت، سماجی مسائل کی عکاسی اور عشق و عاشقی کے عالمگیر وہمہ گیر موضوعات کو احاطہ کرتی ہے۔

دل کا یہ ازلی ابدلی فطری اور سدا بہار جذبہ ہر ہمدرد شاعر کے دل میں موجزن پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ موضوع ہر ایک کا ترجمان ہونے کے اسباب سبھی کے دل موہ لیتا ہے۔ فرخندہ نے بھی قلبی واردات، جذبات واحساسات، مشاہدات اور تجربات کو نچوڑ نچوڑ کر شاعری کی ہے۔ بلاشبہ وہ ایک عظیم شاعرہ ہیں۔ ایسے شاعر ہمارا فخر ہیں جن کا قلم خاموشی سے چلتا رہتا ہے۔ اور فرخندہ رضوی صاحبہ کی شعروں سے بھری کے کیاریاں ہر موسم میں گلہائے رنگا رنگ کی بہاروں سے ادب کو سجاتی رہیں گی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

کتابیات

بنیادی ماخذ:

☆ فرخندہ رضوی، سنو خموشی کی داستان، آئیڈیل پبلی پبلشرز اردو بازار کراچی، 2002ء

☆ فاخرہ بتول، گلاب خوشبو بنا گیا، فن پبلی کیشرز، لاہور، 2004،

☆ فرخندہ رضوی، فاصلے ستارے ہیں، یونائیٹڈ صابری پبلی کیشنز اردو بازار کراچی، جنوری 2006ء

☆ فرخندہ رضوی، زیر لب، بزم تخلیق ادب پاکستان، کراچی، 2012ء

☆ فرخندہ رضوی، خوشبوئے خندہ، بزم تخلیق ادب پاکستان کراچی 2018ء

ثانوی ماخذ:

☆ القرآن

☆ احتشام حسین، سید، تنقید جدید، علی گڑھ یونیورسٹی پبلی کیشنز، 1987ء

☆ احمد ساقی، دروازہ، مکتبہ قدسیہ لاہور، 2018ء

☆ اسداللہ خان، مرزا، غالب، دیوان غالب، نیئر اسد پرنٹرز لاہور، 2001ء

☆ الطاف حسین حالی، مولانا، مقدمہ شعر و شاعری، سیونتھ سکائی پبلیکیشنز لاہور، اکتوبر 2015ء

☆ امجد مرزا امجد، تخلیق خندہ، اردو سخن پاکستان، اردو بازار چوک اعظم لیہ، 2021

☆ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، اشاعت مارچ، 2017،

☆ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر، عزیز بک ڈپو لاہور، 1998ء

☆ انور مسعود، اک دریچہ اک چراغ، دوست پبلی کیشنز، 2008ء

☆ تسلیم الٰہی زلفی، ڈاکٹر، تخلیق خندہ، اردو سخن لاہور، 2021ء

☆ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ارسطو سے ایلیٹ تک، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 1997ء

☆ سبط حسن، سخن در سخن، مکتبہ دانیال، کراچی، 1987ء

☆ شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ (طبع چہارم) احباب پبلشرز لکھنو دہلی، 1954ء
☆ شبلی نعمانی شعرالعجم (حصہ پنجم) الفیصل ناشران وتاجران کتب اردو بازار لاہور، جون 1999ء
☆ شکیل الرحمان، ڈاکٹر، امیر خسرو کی جمالیات، نئی دلی ماڈرن پبلکیشنز ہاؤس، 1996ء
☆ شمس الحق (مرتب)، مرزا غالب اردو کی ضرب المثال اشعار (تحقیق کی روشنی میں) فکشن ہاؤس لاہور 2013ء
☆ عابد علی عابد، سید، البیان، مجلس ترقی ادب لاہور، 1998ء
☆ عبدالضیم عزیزی، ڈاکٹر، اردو لغت گوئی اور فاضل بریلوی، ادارہ تحقیقات امام رضا انٹرنیشنل کراچی
☆ کلیم الدین احمد، اردو شاعری پر ایک نظر، لاہور رحمانی پرنٹنگ پریس، 1985ء
☆ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اردو افسانہ روایت اور مسائل، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2002ء
☆ لان جائنس، ارسطو سے ایلیٹ تک، مشمولہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 1997ء
☆ ممتاز الحق، ڈاکٹر، اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۷ء
☆ ممتاز بنگلوری، مرتب، طیف غزل، لیکچرار از ڈاکٹر سید عبداللہ لاہور اکیڈمی لاہور، 1984ء
☆ میر سیفی، ریاض مدحت، از ریاض حسین زیدی، ساہیوال، 2000ء
☆ ناصر کاظمی، انتخاب انشاء، فضل حق اینڈ سنز پبلشرز اینڈ پرنٹرز دربار مارکیٹ لاہور، دسمبر 1991ء
☆ نظیر اکبر آبادی، جواہر کلیات نظیر، حصہ اول، مکتبہ اول ابراہیمہ اورادباہمی حیدر آباد، 1985ء
☆ یوسف حسین، ڈاکٹر، اردو غزل، زاہد بشیر یز نٹرز، اردو بازار، لاہور، طبع اول، 1952ء

☆☆☆☆☆☆☆

Farkhanda Rizvi

Shayeri aur Shakhsiat

By

Nazia Kausar

سرکاری اور نجی یونیورسٹیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے جوئندگانِ علم کے لیے تحقیق وتنقید کے نئے در وا کر دیے ہیں مگر تحقیق وتنقید کے معیار میں گراوٹ آ گئی ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی اسکالر محنت اور دل جمعی سے اپنے کام کو انجام تک پہنچاتا ہے تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ نازیہ کوثر کی یہ کاوش جوان کا ایم۔فل کا مقالہ ہے اس لحاظ سے قابلِ ستائش ہے کہ انھوں نے ملازمت اور عائلی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ جس محنت اور لگن سے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا مشکل کام تھا۔ وہ خود بھی شاعری کرتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے فرخندہ رضوی کی شاعری کو خوب سمجھ کر اس کا فکری وفنی تجزیہ کیا ہے۔ یہ نازیہ کی پہلی کاوش ہے جو کتابی شکل میں سامنے آئی ہے جس پر میں اسے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یہ اسی پر اکتفا کر کے بیٹھنے کے بجائے آگے بڑھیں گی، Ph.D کریں گی اور تحقیق وتنقید کے میدان میں نام پیدا کریں گی۔

ڈاکٹر مشتاق عادل

ایسوسی ایٹ پروفیسر

صدرِ شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سیال کوٹ

Husn e Adab Faisalabad

03217044014, 03457763014